

ضروری باتیں

ہوتے ہیں اور ۱۹۶۲ء کو ماکٹ حقیقی سے جا ملتے ہیں۔ چکبست بڑے ڈن پرست شاعر ہی تھے۔

شاعر، ادیب اور فقاد پڑت برج نارائن چکبست کشیری بہمن تھے۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے لیکن اواکل عمری میں لکھنؤ آگئے۔ ۹ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع ہیا۔ کسی استاد کو کلام نہیں دکھایا۔ کثرت مطابع اور مشنن سے خود ہی اصلاح کرتے رہے۔ کوئی غصہ بھی نہیں کیا۔ ہمیں کہیں لفظ چکبست پر، جوان کی گوت تھی، اکفا کیا ہے۔ شاعری کی اہم تریخ سے کی۔ ۲۔ گے چل کر قومی نظیں لکھنے لگے۔ کئی مرتبہ مریشے۔ بھی لکھے ہیں۔ نہ میں مولانا شرسر سے ان کا معز کرہ شہور ہے۔ ایک رسالہ ستارہ صبح بھی جاری کیا تھا۔ مجموعہ کلام صبح ڈن کے نام سے شائع ہوا۔

اردو شاعری کی تاریخ میں چکبست کا یہ شعر ان کی شاخت بن گیا۔ زندگی کیا ہے عاصر میں ظہور ترتیب

موت کیا ہے اُحیں اجزا کا پریشان ہونا
صرف 44 سال کی عمر پانے والے چکبست نے اپنی قومی اور وطنی
شاعری کے ذریعے لوگوں میں وطن پرستی کے جذبے کو مضبوط کیا۔
چکبست نے بارہ سال کی عمر میں اپنی پہلی نظم "حب قومی" کی۔ نظم
میں سادے انداز میں ڈن سے محبت کے جذبات کو پیش کیا۔
حب ڈن کے موضوع پر کہی گئی چکبست کی شاہکار نظم "خاک ہند"
ہے۔ یہ نظم 1905ء میں لکھی گئی۔ نظم کے پہلے شعر میں ہندوستان کی عظمت کا ذکر کیا گیا۔ وہ کہتے ہیں:

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لئے روائ ہے
نظم کے اہنگی ہندوں میں چکبست نے خاک ہند پر جاری
قدرت کی نعمتوں پر ہاں کے ندی نالے، پہاڑ، جنگل، بیباں، خوبصورت مقامات
اور عظیم شخصیات کا ذکر کیا۔ اور لوگوں کو یہ احسان دلایا کہ ہمارا ڈن زندگی کے ہر
شعبے میں کس قدر بلند مقام رکھتا ہے۔
ہم آج ۲۶ جنوری، جشن یوم جمہوریہ کے اس خاص دن پر چکبست
اور تمام ڈن پرست شمرا اور ڈن پرست بھارت واسیوں کی گہرائیوں سے
سلام کرتے ہیں۔

مدی سبق اردو
۲۰۲۰ء، جنوری ۲۶

یہ ہمارے لئے باعث افتخار ہے کہ جمہوریت کا سارا غیر ہمارے ڈن عنزیز ہندوستان میں تقریباً سو سال بیل میج یعنی کہ گوت پدھر کی پیدائش سے قبل بھی نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں جمہوری ریاستیں موجود ہیں جنہیں "جن پر" کے نام سے جانا جاتا تھا۔

"Democracy is a rule of the people, for the people and by the people"

عوام کی حاکیت، عوام کے لئے عوام کے ذریعہ
ہمارے یاں بھارت میں جمہوری نظام کیا ہے، اس سے ہم سب خوب واقف ہیں۔

ہم نے اس بارہ یوم جمہوریہ بڑے ہی شان و شوکت کے ساتھ منایا۔ اس موقع پر دارالحکومت دلی میں منعقد کی گئی فوجی پریڈ میں ائمی نئے ہتھیاروں کی نمائش کر کے فوجی طاقت کا ظاہرہ کیا گیا جو اس بات کا اٹھارہ بھی ہے کہ ہم اپنے ملک کی خاکافت کے لئے کسی کے کم نہیں ہیں۔ رنگارنگ و دردپوس میں بیوں دستوں نے ہماری شفاقتی کو ناگوں درشکی نہائی کی۔

ہمارا دیش 15 اگست 1947ء میں برطانوی تسلط سے آزاد ہوا۔ اور تین برس کے اندر 26 جنوری 1950 کو اپنے آئین کی مظہوری دے دی گئی۔ اس وقت سے اس روز کو ہم بڑے ہی پر مسرب طریقے سے یوم جمہوریہ کے طور پر منانے ہیں۔

26 جنوری یعنی یوم جمہوریہ بھارت کی ایک قومی تعظیل کا دن ہے۔ جسے ملک بھر میں بڑے ہی جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ دیگر دو اہم ترین تعظیلات 15 اگست اور گاندھی جتنی ہیں۔

ہمارے ملک کو دشمنوں کا ہبایا ہونے کی چیز کے نام سے بھی جانا گیا۔ ہمیں اس پر فخر ہے لیکن خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہنا چاہیے۔ ماہنامہ سبق اردو کا یہ شمارہ جنوری، فروری (۲۰۲۰) کا مشترکہ شمارہ ہے۔ پڑت برج نارائن چکبست کے لیے جنوری اور فروری دونوں مہینے بڑے اہم ہیں۔ وہ جنوری میں اس جہان رنگارنگ میں جلوہ افرزو ہوتے ہیں اور فروری کو جہان فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ وہ ۱۹ جنوری ۱۸۸۲ء کو فیض آباد میں پیدا

سبق اردو

جنوری، فروری ۲۰۲۰

جلد: ۵، شمارہ: ۱

sabaqeurd.com
ISSN 2321-1601
RNI NO.:UPURD/2016/67444
SABAQ E URDU(Monthly)
GOPIGANJ-221303,BHADOHI(UP)INDIA
Mobile & Whats App 9919142411,9696486386
sabaqeurd@gmail.com
roznamaazeemindia@gmail.com

اڈیٹر، پڑھنے، پہلو: ڈاکٹر محمد سعید
پرنسپل: چشم ام اٹریا پرنگ پرنسپل گوپی گنچ، ضلع بحدوہی یونی
فی شاہراہ ۲۵۰، روپے ۱۲، شمارہ: ۲۵۰، بیرونی ملک: بھیاس امریکا ڈالر
چک، ڈرافٹ: SABAQ-E-URDU(Monthly)
انٹرنیٹ بینکنگ: SABAQ-E-URDU (Monthly)
IFSC BARB 0 GOPI BS A/C 28240200000214

کسی بھی تحریر سے ادارہ کا حقن ہونا لازمی نہیں ہے۔ کسی بھی معاملے کے سواتی صرف ضلع بحدوہی یونیکی عدالت میں ہوگی۔ ادارہ

۵۵	رات	اقبال حسن آزاد	۱۱	ضروری باتیں	مدیر
۵۶	جو ان مرگ اہل قلم	الدارہ	۳	ہری چند اختر کا نفری اور	پروفیسر خواجہ اکرام
۵۷	شاذ تمکنت کی شاعری	محمد زبیر		شعری اسلوب	الدین
۵۸	میں هجر و فراق کا پھلو				
۵۹	بڑوین شاکر کی شاعری کے مختلف رنگ	فہیمنہ علی	۹	جنگوں کے اثرات سے اردو	قاسم یعقوب
۶۰		افروز عالم، ذبئی	۱۰	شاعری کی نفسیاتی تشكیل	ذکر عشت ناهید
۶۱	غزل	دانش، کوثر مظہری، حیدر	۱۱	ایک لفظ کی موت (صادق	ایک شاعر ایک شعر
۶۲		ایک شاعر ایک شعر		کی تجربیاتی کہانیاں)	
۶۳	قریشی، فراغ رہوی		۱۵	موقع شہپر رسول	ذکر عادل حیات
۶۴	اقبال مجید کی ادبی ...	شاهدہ شفیق	۲۳	۳ نظمیں	ستیہ پال آنند
۶۵	غزل	مینا خان	۲۵	۳ غزلیں	یاسمین حمید
۶۶	تھیمات و ترجیحات	ذکر شیخ عقیل	۲۶	۸ نظمیں	عشتر معین سیما
۶۷	DAL دلیا	ظرف اقبال	۳۱	۲ غزلیں	صفدر ہمدانی
۶۸	بند قبا سے متعلق اشعار	گوہر زهرہ	۳۳	نظم اور ۲ غزلیں	سلیمان خمار
۶۹	پروفیسر پرشکیف ناجوف	کیا محبت دماغ میں بعض	۳۵	اردو کے اہم ادبی جرائد ...	ذکر اسد فیض
۷۰	کیمیکلز ..			شموئل احمد کی افسانہ	ذکر پرویز شہریار
۷۱	ذکر صالحہ رشید			نگاری	
۷۲	تھہیم			یادوں کی دستک	نعیم الرحمن
۷۳	سفر جاری ہے	پر تھال سنگھ بیتاب	۳۵	نیویارک میں جشن ڈاکٹر	فرح کامران
۷۴	ہے خیر گرم	خبرنامہ	۳۶	عبدالله	
۷۵	سن تو سوئی ...	تأثیرات		کہت کبیر سنو بھئی سادھو،	سفینہ سماوی
۷۶	۸۰ EDITORIAL BOARD	مجلس ادارت	۳۹	اسی میں سائین ہمارا	
			۵۳	پروفیسر اویس احمد دوران	ذکر منصور خوشنور

چیف ایڈیٹر
ڈاکٹر دانش ال آبادی

ہری چند اختر کا نثری اور شعری اسلوب

پروفیسر خواجہ اکرام الدین

آئیں۔ غزل کی جگہ نظم نے لے لی، موضوع کی پیمائش سے اسلوب شعر متاثر ہونے لگا۔ ادب مشور کے تحت لکھا جانے تو نہیں نہ کہیں تخلیقیت کا متاثر ہونا بھی فطری امر تھا۔ اسی طرح مختلف ادبی نظریات کاظمیوں میں آنا بھی فطری تھا۔

اسی دور نظریات میں ایک صاحب طرز ادیب اور شاعر ادب کی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ جسے اقبال، سر عبد القادر، ظفر علی خاں، راجح زندرا نام تھے، رائے پہاڑ کوئی نہیں، حفیظ جالندھری، جوش پنج آبادی، جوش ملیانی، عرش ملیانی جیسے بامکاںوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ معاشری زندگی کی شعبدہ بازیوں سے دور ہنپہ والا سید حاسادہ انسان جب شاعری کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو شاعری کے اپے کرتب دیکھانے لگا کہ عوام و خواص کا اس کی جانب مائل ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ لیکن تعجب اس بات کی ضرور ہے کہ ایسا پاکیل شاعر ایسا ہے بروائی ہو گا کہ اس نے اپنی تخلیقات کو سنپھال کر بھی نہیں رکھا۔ نثر و نظم میں فکر و فکر کی نیرنگیاں بکھریں والا پڑت ہری چند شرما جو بعد میں پڑت ہری چند اختر کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔ اس کی تحریریں اب تک زیور طبع سے آرستہ ہو سکیں۔ ادب میں کے قارئیں اور نقادیں ان کے نام سے کم ہی واقف ہیں۔ بھلاہ عرش ملیانی کا کہ انہوں نے ان کے لئے اور اپنے اور اپنے ”کفر و ایمان“ کے نام سے شائع کر کے ادب میں ان کے نام کو جاؤال کرنے کی کوشش کی ہے۔ بھلاہ ہور بخت کا کہ ان کے پورٹل پر یہ مجموعہ کلام موجود ہے جس کے سبب ہم جیسے قاری کی اس تک رسائی ممکن ہو گئی۔ اگر ہونہ ہوتا تو کچھ ہی دنوں میں ان کا نام ادب سے گلستان ہی ہو جاتا۔ بھلاہ ہو آئیہ کیوں نکشن کے صدر آصف عطی کا انہوں نے اس سینمار کے الفقاد سے ان کے نام کو ادب کے مظہر نامے پر لانے کی مست میں کامیاب کوشش کی۔ پڑت ہری چند اختر کی تحریروں کی عدم دستیابی کی وجہ ہی ہے کہ ان کے نام چند ایسی کتابوں میں بھی نہیں، جن میں ضرور ہونا چاہیے تھا۔ اردو کے ہندو شعرا کی دوجلوں میں ان کو جگہ نہیں مل سکی، اہل پنجاب کے شعرا کوئی تخلیقی مقامے کھھے گئے گر بہاں بھی ان کا تذکرہ نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ سرف یہ ہے کہ ان کی تحریروں کو جمع کرنے کی سیدھیگی سے کوئی کوشش نہیں ہوئی ہے۔ جبکہ ان کی شعری اور نثری تحریریں ایسی ہیں کہ انہیں ادبی کینیں میں نمایاں جگہ نہیں چاہیے۔

ٹلاش بسیار کے بعد ان کی دونسری تحریریک میری رسائی ہو گئی۔ ایک دور ایسا بھی آیا کہ اس پر مقدمہ بت غالب آگئی جس کے سبب ادبیت مجرد ہونے لگی۔ خاص طور پر اردو شاعری میں یہ بدلیاں بہت تیزی سے جنوری، فروری ۲۰۲۰ء پروفیسر، ہندستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہر و یونیورسٹی، بی بی دہلی

تعارف:

پڑت ہری چند اختر تھا جو پنجاب یعنی غیر منقسم ہندستان کیا جاں گا؛ اس ہشدار پور، مشرقی پنجاب میں ۱۵ اپریل ۱۹۱۰ء میں بیدا ہوئے۔ شش فاصل کا امتحان پاس کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سیاگر بری میں ایم۔ اے کیا۔ پنجاب اسٹبلی میں کچھ عرصے تک ملازمت کی۔ لاہور کے شہر ”پارس“ کے مددگار بھی رہے۔ لاہور میں ان کی زندگی کا پیشتر حصہ گزارا۔ وہ یک وقت شاعر، ادیب اور صحافی تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ شاعری کا اعلیٰ ذوق تھا۔ احباب کی مخلیفیں ان کی موجودگی سے عفران زرا رہتی تھیں، ان کی حاضر جو یا اور بدله تھی سے لوگ لطف انہوں ہوتے۔ ان کی طبیعت میں سادگی پسندی تھی۔ احباب اور ضرورتمندوں کی مدد کرنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ تقیم ہند کے بعد ہندستان آگئے گروہ خوش نہیں تھے۔ کیم جنوری 1958 کوان کا انتقال ہوا۔

ہری چند اختر کی شاعری اور نثری تحریریں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے مگر سمجھیگی سے اگر اس جانش مائل ہوتے تو وہ ادب کے سرمائے گر انقدر اضافہ کر سکتے تھے مگر جس قدر ہمیں ان کی نگرانی موجود ہیں ان کی قدر و قیمت بھی کسی طور کم نہیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو سمجھا کر کے کلیات کے ٹھکل میں شائع کیا جائے۔

بیسویں صدی کا صاف اول بر صفحہ ایشیا کی تاریخ تہذیب اور ادب کے لیے انقلاب آفرین تغیرات کا زمانہ رہا ہے۔ اس پرے عہد میں ایشیا کے اس بڑے خطے میں زندگی کو یکسر تبدیل کر دینے والے ایسے واقعات روپما ہوئے ہیں جن کی بازوگشت اب تک نہیں دے رہی ہے۔ اسی لیے اس عہد کو تغیرات کے عہد سے موسم کیا جاتا ہے۔ ان تغیرات نے جغرافیائی حدود بھی بدلتے اور صدیوں کی تہذیب و ثقافت کو بھی متاثر کیا۔ اس تبدیلی نے کئی سطح پر انسانی ایسے کو ختم دیا ہے تاریخ نے بھی تھوڑے کیا ہے اور ادب نے بھی اسی عہد کے کرب کا پیٹے اندر سویا ہے۔ ادب اور تاریخ میں ان سماجات کو درج کرنے کا طریقہ جدا گانہ ہے۔ تاریخ میں ساٹ حقائق کو پیش کیا جاتا ہے، جس میں اختلاف واتفاق کی گھجائش موجود ہیں۔ لیکن ادب میں ان سماجات کو جس طرح پیش کیا گیا ہے اس میں زندگی کے شش جہات پہلوؤں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس دور کی ایک بڑی بات یہ ہے کہ اس دور میں زندگی کے تیزی سے بدلتے والے مطالبات کی طرح ادب کے نظریات بھی بدلتے گئے۔ ادب میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ اس پر مقدمہ بت غالب آگئی جس کے سبب ادبیت مجرد ہونے لگی۔ خاص طور پر اردو شاعری میں یہ بدلیاں بہت تیزی سے

آہنگ کے بارے میں کہا تھا:
اگر خوب محبوب جو سورہ ہے سنوارے تو نور علی نور ہے
وہی سے میر تک بلکہ پورے کلائیکی عہد میں وزن و شعر کو ایک
خاص اہمیت حاصل تھی۔ اسی نظریے اور قصور کی جانب ہری چند اختر نے ان
جملوں میں متوجہ کیا ہے۔

اب اور جملے لاحظہ ہوں:
”قویولت کے پیدا ہونے کا وقت مقرر کرنا اور اس کے بڑھنے،
پھیلنے، گھٹنے، سمنٹنے سے اس کی عمر کا اندازہ لگا ناخت شکل ہے۔

”(ص 4 دیباچہ سوز و ساز)
یہ جملہ حفظ جاندہ ہری کی مقبولیت کے حوالے سے اور مقابل
میں ان شعر کو طرکا نشانہ بنا یا ہے جو مقبولیت کے لیے طرح طرح کے حرے
استعمال کرتے ہیں۔ اگر ایسے شاعروں کو مقبولیت مل بھی گئی تو وہ وقتی ہوتی۔ اس
جملے میں انہی باتوں کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اسی مفہوم کے پھر اور جملے لاحظہ
ہوں :

”پس جہاں بزم شعروخن میں تعارف و تقریب کا تعلق ہے یہ کام
بااضافی حد تک انجام پا جا ہے۔“ (ص 2 دیباچہ سوز و ساز)
”انہیں الی بزم نے تسلیم کر لیا ہے یا نامطبوع اور نامقبول کہہ کر رد کر دیا ہے۔“
(ص 2 دیباچہ سوز و ساز)

حفظ جاندہ ہری کی شعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ادب کی اہمیت پر یہ ملین جملہ
لاحظہ ہو:

”کسی قوم کی تاریخ کو اگر اس کے سوانح حیات قرار دیا جائے تو
لڑپچکاوس کے خود نوشت سوانح حیات کہنا بالکل بجا ہوگا۔“ (ص 6 سوز و ساز)
بعض شعریے ہوتے ہیں جن کی قدر و منزرات کو لوگ نہیں پہچان پاتے۔ لیکن
ایک دور ایسا آتا ہے کہ ان کی شعری کی مقبول خاص و عام ہو جاتی ہے۔
ایسے ہی شاعروں میں ایک نام ہومرا کا ہے۔ ہری چند اختر نے ہومرا کے بارے
میں لکھا ہے کہ:

”جب زندہ تھے تو اس کے اشعار سن کر کوئی بھی مشکل سے
دیتا تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ یونان کے وہی سات
شہر گئی کوچل میں در بر غاک بر رائی میکھتا پھرتا تھا اس کی جائے ولادت کا فخر
حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے لڑنے بھجنے لگا۔“
(ص 4 دیباچہ سوز و ساز)

اب شعری رویے کی می اور شعر اکی محدود نمائش پر یہ جملے دیکھیں:
”ڈُگر پرست فاعل اتیوں کے جذبات کا اختر اس پہلو بھی رکھا گیا
ہے۔“ (ص 14 سوز و ساز)

”ملا اس نمائش کا نتیجہ ”مفسر ما خورد و حق خود درید“ کے سوا کچھ نہیں۔“ (ص
12 سوز و ساز)
”غزل کی مخالفت میں کچھ دست سے ایک ہر بونگ سی بیچ رہی ہے
اور مزہ یہ ہے کہ اس طوفان میں بعض بسجدہ و فہیدہ اشخاص کے پاؤں بھی اکثر

آپا دکن 1933ء و سرا بھی جوش ملسانی کے مجموعہ؟ کام بر مقدمہ ہے۔
مقدمہ ”جنون وہوش“ جوش ملسانی۔ ٹشی گلاب چند سکھا بیدے نہ مرمیلی۔ نکلس
روٹ، ولی) اس کی تاریخ اشاعت معلوم نہ ہوگی۔ میں نے ان کی اہمیت دو
نشیخ تحریروں اور شعری مجموعہ ”فکر و ایمان“، ”اپنا خیون لکھا ہے۔ بظاہر
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قابل سرمائے پر کیا گھنگو ہو گی مگر سچائی یہ کہ ان کی
نشر ایک ایک جملے پر رک رک غور و فکر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ عام طور پر لوگ
اٹھیں شاعر کے طور پر جانتے ہیں مگر ابھی یہ عقدہ نہیں کھلا ہے کہ ان کی نظر ادبی
نقد و تصریہ پر بھی خوب گہری تھی۔ پہنچت ہری چند اختر کو شرقی شعری روایات کا
گہری علم تھا۔ اپنے عمدہ کے چیلی میثاق نامے پر بھی گہری نظر تھی۔ علم عروض
پر اٹھیں مہارت حاصل تھی۔ وہ فی المدیہہ شعری بھی کہتے تھے۔ ان کی طبیعتی
میں ہیں مراجح بھی کوٹ کر بھری تھیں۔ احباب کی مخلیلیں ان سے عفران
زار ہو جالیا کرتی تھیں۔ چہ حیثیت انسان وہ اعلیٰ اقدار کے حال تھے۔ یہ تمام
صفات ان کی نشر میں دینیے جاسکتے ہیں۔ یہاں میں ان کی نشر (دونوں
مقدموں کے حوالے سے) پر پہلے گھنگو کروں گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے صاحب طرز ادیب ہیں۔ ان کے جملے
بڑے بے ساختہ اور فطری اثر آتے ہیں۔ صاحب طرز ادیب کی صفت یہ ہے
کہ ان کے جملے ساخت کے لحاظ سے منفرد بھی ہوں اور لحظہ و متنی کے اعتبار سے
مربوط بھی ہوں۔ اس میں شخصیت کا عسکر بھی ہو اور احصار و اجمال کی صفت
سے متصف بھی ہو۔ ایک بڑی خوبی پر بھی کہ وہ بولتے ہوئے جملے بھی ہوں۔
ذیل میں دیباچہ ”سوز و ساز“ حفظ جاندہ ہری سے چند ایسے جملے لاحظہ کریں:
”جوش گوا کیشوں اور فوق ابھر کیں میزیز“ کے باوجود اس

”طرح نا کام نہ رہتا۔“
(ص 18 دیباچہ سوز و ساز)
اس جملے میں ان شاعروں کو طفرہ کا ہف بیالی ہے جو کلام میں
موضوع نہیں مضمون اور وزن کی پاہمی مناسبت کا خیال نہیں رکھتے بلکہ خوش
گلوبی سے کلام کے عیوب کی پرده پوشی کرنا چاہتے ہیں اور مقبولیت کے بھی
خواست گار ہیں۔ یہ مخفی ایک جملہ نہیں بلکہ اس میں ایک تغیری بھیست بھی
ہے۔ شعر کے حصہ کا مشرقي معیار یہ ہے کہ اس میں حسن نہیں آتا۔ اسی لیے وہ کلام کو عروض
صرف لکھنوں کو سمجھنے سے کلام میں حسن نہیں آتا۔ اسی لیے وہ اور وزن کو زیر پور کہتے ہیں۔ ان کا یہ جملہ بھی دیکھیں:

”پس عروں خوب باز یور ہو تو سیحان اللہ اور اگر بے زیور ہو تو بھی
کوئی حرج نہیں۔ لیکن عروں کا خوب ہونا ضروری ہے بلکہ میرے خیال میں
عروں خوب کو بھی زیور اسی صورت میں نہیں دے سکتا ہے جبکہ وہ اس کے
دوسرے تمام محاسن سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہو، ورنہ زیور کی تو یہ صورت بھی
ہو سکتی ہے کہ ایک پری چہرہ خاتون کو اگر بڑی لباس پہننا کر گلے میں سیر سا سیر کی
ہندستانی بیکل باندھ دی جائے۔“ (ص 17 دیباچہ سوز و ساز)
ہم دکن کی سر زمین میں ہیں تو ملاو بھی کہ وہ شعر بھی یادداشت میں حفظ کر
لیں جو انھوں نے ”در شرح شعر گوید“ کے عنوان سے کہا تھا۔ وہی نے وزن و

(دلی) کے۔

ہری چند اختر کو عروض اور شعری کمالات کا خوب علم تھا۔ ان کے ہم عصروں نے بھی اس کو شیئر کیا ہے۔ اپنے عہد کے کے شعری روپے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہندستانی اوزان کو اپنائے کی وکالت کی ہے وہ لکھتے ہیں: ”ہندستانی موسیقی اور دوشاعری کے تال سم میں بیٹا ہر کوئی عشق نظر نہیں آتا۔ ملکی ذہنوں سے غفلت بلکہ دانستہ بے اختیاری روا رکھی گئی ہے تھی کہ ہندستانی گیت اور دوشاعری کے نام نہاد عروضیوں کو اس لیے غیر مزود معلوم ہونے لگتے ہیں کہ ان میں ملکی ذہن حفاظت سے کام لیا جاتا ہے۔ کیا یہ افسوسناک بات نہیں کہ جو سر اور تال ہندستانیوں کی روح میں بے ہوئے ہیں ان کو اپنی اور غیر مانوس گردانا جائے، اور غیر مانوس زیر و بم ہمارے اشعار کی موزو دیتی یا عدم موزو دیتی کا معیار ہتا لے جائیں؟“ (ص 11 دیباچہ سوز و ساز)

اس مقدمے میں جوش ملیانی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ہوئے انھوں نے صفت غزل پر رائے دی ہے۔ اس رائے میں بناہ کوئی نئی بات نہیں لیکن اس رائے سے پہنچت اختر کی شاعری کی فہم اور مشرقی شعری روایت کا احراام دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تصریے اور تقدیم کے لیے جو زبان استعمال کی ہے اس کے سلوب کو دیکھیں تو اندازہ ہو گا کہ یہ وہ اسلوب ہے جس کی آزادنے ابتداء کی اور حالتک تقدیم میں تقریباً یہی اسلوب موجود ہے۔ اقتباس دیکھیں:

”حقیقت یہ ہے کہ غزل اپنی صورت و ترکیب اور نس مضمون ہر دو اعتبار سے شاعری کی نیاد بھی ہے اور معراج بھی۔ حسن بیان شاعری کا اہم ترین ہزو ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ حسن بیان ہی شاعری ہے۔ حسن بیان میں صدق محاورہ، زبان کی صفائی، بیان کی صفائی اور تازگی، حسن ترکیب، خوبی؟ استعارہ، لطفِ تشییہ، مضمون کے ساتھ الفاظ کی مطابقت وغیرہ سب کچھ شامل ہے اور ان کے علاوہ اختصار و جامعیت۔ ظاہر ہے کہ جب تک حسن بیان کے ان تمام اجزاء تکمیلی پر عبور نہ شاعر اور اس کی شاعری دونوں ناکام رہتے ہیں۔“ (ص 26 مقدمہ ”جنون و ہوش“ جوش ملیانی۔ مشی گلاب چند سکھائیز نہیں۔ نکسن روڈ، دہلی)

غزل کے موضوعات اور حسن کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”غزل کے مضامین میں جوشی جذبات، جوشی تمدن، بھر کارون، صل کی آرزو، رجھک و رقبابت، سوز و گلزار، نالہ؟ دفریا، ٹکوہ؟ وہ کیا ہے، تاک جھاںک، نامہ و پیام، رندی و مستی سب کچھ ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ سوز و رقت کے بغیر غزل لطیف ترین صفت شعر کی جگہ سیاست داں کی ڈاڑی یا پنساری کے بیچ بیٹھ کر رہ جائے۔ لیکن دوسری جانب وہ شاعر بھی قابل معافی نہیں جو غزل کو مرشیہ بناؤ لے ہیں اور اور اپنی قافیہ بیانی کو ایسی ریک اور مکروہ بواہی سے آلوہ کرتے رہتے ہیں جس پر فتنے، شہدے اور زنان بازاری بھی شرم سار ہوں۔“ (ص 26 مقدمہ ”جنون و ہوش“ جوش ملیانی۔ مشی گلاب چند سکھائیز نہیں۔ نکسن روڈ، دہلی)

کے۔“ (18 سوز و ساز)

در اصل یہ وہی زمانہ ہے جب ترقی پسندیت کے تحت غزل معتبر ہوئی اور بغیر کی تال کے غزل کو نشانہ بنا یا جانے لگا تو ہری چند اختر نے یہ بات کہی۔ وہ کسی نظریے کے خلاف نہیں تھے مگر اس فیشن کے خلاف تھے۔

ان جملوں کے بعد ہری چند اختر کی تقدیم بصیرت کو دیکھیں۔ ہری چند اختر مانتے ہیں کہ شاعری کی قدر و قیمت کی شاخت آسان نہیں، یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ کسی شاعر کو اس کی زندگی میں ہی شاعری کے سبب عزت و قوی مل جائے۔ لیکن اگر شاعری میں فی جو ہر موجود ہے تو کسی نہ کی دن اس کی قدر و قیمت پہچانی جائے گی۔ اس بات کو کہنے کے لیے ہری چند اختر نے جواب لجھہ اپنایا ہے اسے دیکھیں اور اندازہ لگا میں کہ نقد و تصریہ کی یہ زبان کیی گفتہ ہے:

”اردو شاعروں میں غالب اور ذوق کو لجھے۔ اپنی زندگی میں ذوق ملک الشعرا، خاقان، ہند تھا اور غالب مہل گو۔ لیکن آج ملک خن میں غالب کا سکھ روان ہے اور ذوق کی شہرت آزاد مر جوم کا وہ سحر کا قلم بھی قائم نہ رکھ سکا جس نے اس ٹھیٹھاتے ہوئے چڑاغ لو آفتاب عالم تاب ثابت کرنے کی کوشش میں اردو شاعری کو کم از کم پیاس سال پیچھے ڈھل دیا۔“ (ص 4 سوز و ساز)

اس اقتباس میں آزاد و حالی کارنگ بھی ہے اور مروجہ تقدیم پر طبع بھی ہے۔ ہری چند اختر، صاحب اسلوب اس لیے بھی ہیں کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں تقدیم اور طبع کا پیرا یہ اپناتے ہوئے اپنی باتوں کو ٹھاٹ کرنے کا خوبصورت طریقہ لکھا۔ اپنے عہد کے تقدیمی روپے سے مطمئن نہیں تھے اسی لیے انھوں نے اس پر گھرا طبع بھی کیا ہے۔ ان کی نظر مشرقی شعری و ادبی روایات پر بہت گھری ہی ذیل کے اقتباس کو دیکھیں اور ہری چند اختر مجھش شاعر اور فی البدیہ شاعر کے طور پر مشہور ہوئے ان کی تقدیم بصیرت کو دیکھیں:

”ایشیانی قادر یورپی عینک کے بغیر اپنی بصارت کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے اور بعض اوقات تو انھیں اس عینک کے بغیر کچھ جھانکنی نہیں دیتا۔ غالب کی مثال سے جہاں وقت رائے کی بے وقتی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ راز بھی کھلتا ہے کہ بعض قابل قدر جدتیں جل از وقت مرض و جود میں آکر کچھ حدود کے لیے نا مطبوع بلکہ مردود ہو جاتی ہیں مگر وقت آنے پر ان کی ایسی قدر ہوتی ہے کہ ملک کے لٹرپرک میں وہی جگہ حاصل ہو جاتی ہے۔“ (ص 5 سوز و ساز)

ای طرح اس زمانے میں ترقی پسندی کا زور تھا۔ لیکن اس کے متوازن رجحانات بھی اسی شدت سے موجود تھے۔ اس کلکش ادب و شعر کے حوالیے ہری چند اختر کہتے ہیں۔

”آج کل ہر ادب کو ترقی پسندی یا رجحت پسند قرار دیتا ہی بھی فیشن میں داخل ہے۔ لیکن بد مقنی یہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں وہ بھی ترقی پسند اور رجحت پسند کی کوئی واضح اور جامع تعریف اور ان دونوں گروہوں میں تیزی کے لیے کوئی کسوٹی نہیں پیش کر سکے۔“ (ص 30 مقدمہ ”جنون و ہوش“) جوش ملیانی۔ مشی گلاب چند سکھائیز نہیں۔ نکسن روڈ،

ایسی زمین میں ہری چند کے پیا شعار ملاحظہ ہوں:

کہیں افراط نہیں ہے چہڑا افراد
کہیں خون جباقبی نہیں ہے

خود خبر و شر کا یہ تیجہ کس نے سوچا تھا
خدام فرو، آدم جاں بلب، شیطان باتی ہے

مجالِ دم زدن کس کو ہے یار ب
مگر یہ شان رزاقی نہیں ہے

ترے احکام کی دنیا، مرے اعمال کا محشر
یہاں میری، وہاں تیری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

اب پی شعر بیکھیں:

پتا بھی اگر ہلتا ہے تو اس کی رضا سے
اور بندہ گتھا گر ہے، معلوم نہیں کیوں

ریں دو دو فرشتے ساتھ تو انصاف کیا ہو گا
کسی نے کچھ لکھا ہو گا، کسی نے کچھ لکھا ہو گا

ملے گی شیخ کو جنت، مجھے دوزخ عطا ہو گا
بس اتنی بات ہے جس کے لیے محشر پا ہو گا

یہ وہ اشعار ہیں جن میں شاعر کہیں خدا سے مخاطب ہے اور کہیں شوئی سے کلام
کرتا ہے۔ یہ اسی قبیل کے اشعار ہیں کہ جن پر اقبال پر بھی کفر کے فتوے لگے
تھے۔ اسی لپے میں یہ کہا تھا کہ یہ وہ اشعار ہیں جو ہری چند اختر ہی کہہ سکتے
ہیں۔ مگر ایسا نہیں کہ ان کو حلقت؟ ادب میں محتوب قرار دیا گیا ہو۔ بلکہ یہاں
کاشاعرانہ؟ سلوب ہے کہ ان اشعار میں بظاہر ایسی باتیں ہیں جو کفر کے
سرحد تک جاتی ہیں لیکن اس کے معانی کئی دیگر مفہوم کی جانب بھی رہ جاتی
کرتے ہیں۔ کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو موضوع اعبار سے نئے تو نہیں ہیں
لیکن؟ سلوب کے اعتبار سے مفترضہ ہیں۔ ملاحظہ ہوں ایسے اشعار:

عبادت از پع انعام زاہد
ہوں کاری ہے، مشتاقی نہیں ہے

کہہ دیا لاقطہوا ختر کسی نے کام میں

اب تک ہری چند اختر کی تقیدی بصیرت اور تقیدی اسلوب پر بات
ہوئی اب اسی تقیدی تحریر میں ان کے اسلوب کا ایک اور نگہ ملاحظہ کریں
جسے پیکر تراشی پر محول کر سکتے ہیں۔ جوش ملیانی کا تعارف اس انداز سے
کرتے ہیں:

”جن لوگوں نے اس سے پہلے جوش (ملیانی) کو نہیں دیکھا تھا
اٹھیں کچھ دیر کے لیے ضرور حیرت ہوئی ہوئی، درمیانے قد کا ایک سیدھا سادہ
اوہ چڑ آدمی، معمولی کپڑے کی گذگڑی، قیص اور دھوپی۔ دیکھی جو تباہی، ملابس کی وضع قطع
خلص دیہاتی، شاعرانہ بناوائے استادانہ تھکنٹ، نہ حاشیہ بردار، سراپا خلوص و
اکسار، انداز میں دیہاتیوں کی ای اخلاص بھری سادگی اور بے تکلف، ہونوں پر پلاکا
سامانتان آمیز ہم۔ صورت و شکل دیکھو تو زیادہ سے زیادہ ایک سفید پوش عالمی
کہہ سکتیں۔ ہر خوش سے یوں ملتا ہے میسے خدا سے بھی اپنے مرتبے اور علم کا
احساس نہیں۔ بھلا اس وضع قطع اور انداز میں ناد اتفاق لوگوں کو اس اشتیاق اور
تعریف و توصیف کا جواہر ہاں نظر آ سکتا تھا۔“ (ص 8 جوش و جنون)

ہری چند اختر کے نہیں اسلوب کو آپ نے دیکھا۔ چند اقتباسات
کی مثالوں سے اتنا تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہری چند اختر کو نہیں گاری پر بھی
قدرت حاصل تھی یہ اور بات ہے کہ ان کا بہت زیادہ نہیں سرمایہ موجود نہیں
لیکن ان چند تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تکالیکی نہروں کم سے ان کو
والہاں لگا دیتھا۔ ان کی نہیں پر آزاد، حالی، سلی، اور نذری کے اثرات دیکھے جاسکتے
ہیں۔

جہاں تک شاعری کی بات ہے تو نہ کہے مقلوبے میں شاعری کا
سرمایہ قدرے زیادہ ہے۔ لیکن وہ بھی مخفی ایک مجموعہ؟ کلام ”لغو و ایمان“
موجود ہے جس کی ختمت بھی سو صفحات سے کم ہے۔ کیت کے لحاظ سے تم بھی
مگر وقت کے لحاظ سے کم نہیں ہے۔ اس مجموعے کو پڑھتے ہوئے ان کے اکثر
اشعار تکھر کو بار بار پڑھتے اور غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے بعض
اشعار تایے ہیں جن کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ صرف ہری چند اختر ہی کہہ
سکتے ہیں۔ یہ اشعار بیکھیں جن میں ہری چند خدا سے مخاطب ہیں :

تومرے اعمال کا پانڈل کلاہ شر میں
اے خدامیرے خدا، تھکو خدا سمجھا تھا میں

زندگی پے تک تر انعام ہے بار بگر
سن سکتے کچھ ترے انعام کی باتیں کریں

اب اقبال کے ان اشعار کو ذہن میں رکھیں :

سمندر سے لمبے پیاسے کو شبنم
بخلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

جہاں تجھ کو بخاکر پوچھتے ہیں پوچھنے والے
وہ مندراور ہوتے ہیں شوالے اور ہوتے ہیں

اور دل کو سرخ گونا کر دیا

پچھہ مشہور اشعار:
شباب آیا کسی بنت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا
ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام پچھے یعنی
ہمارے دوستوں کے بے دفا ہونے کا وقت آیا
اہل اقتدار پر طور:
دام شعبدے ہم کو دلھاتا ہے کوئی جلوہ
بیش ترم ہو کر، کہیں پیر مخان ہو کر

میکدے میں بیٹھ کر ایمان کی پروانہ کر
یا اسے بھی ایک دوچالو پلا، دیوانہ کر

اجی کیا شمع کیا پروانہ دوفون جل بجھے آخر
کوئی آش فشاں ہو کر کوئی آش بجاں ہو کر
ہری چند اختر کے شعری اسلوب کی ایک اہم خوبی شوئی و ظرافت بھی ہے۔ ان
اشعار کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ان پر غالب اور مومن کے اثرات بھی ہیں۔ یہ
اشعار دیکھیں:
ہجر کی شبِ ادھر اللہ، ادھر وہ بت ہے
دیکھنا یہ ہے کہاب کوں بلاتا ہے مجھے

تعلیٰ:

مراضیوں سوار تو سن طبع روائی ہو کر
زمین شعر پر پھرتا ہے، گویا آسمان ہو کر

خدائغنوڑ کے، حسین دل لے ہی لیتے ہیں
سی پر پھریاں ہو کر، سی سے سرگراں ہو کر

نئی ترکیبیں:

وفا کی سکیاں اس پر ہوں کے تھیے توہہ
محبت کی فضا تھر اُتی کیا تم نہ آؤ گے

بزمِ دُن ہے خدا کے لیے آرام سے بیٹھے
بار بار اے دل ناداں بچھ کیا ہوتا ہے

میری صورت، مری حالت، مری رنگت دیکھی
آپ نے دیکھ لیا؟ عشق میں کیا ہوتا ہے

جس پیں سارے مسافر ناخداۓ دل کے پاس
کشتی ہتھی نظر آتی ہے اب ساحل کے پاس
ہندو نہب کے فلسفے:
یہ ترے دست کرم کو کھینچ لے گا ایک دن
اے خدار بنے نہ دے دست دعا ساحل کے پاس
گنگا کی پا کیزگی کے ساتھ یہ صور

ہم جو کہتے ہیں ہمیشہ ہی غلط کہتے ہیں
آپ کا حکم درست اور بجا ہوتا ہے

نئی ترکیبات:

خلوص عارضی وہ بھی پر قیمت ڈھونڈنے لگتے
تماشا نامرا دیا تھا سو گوار آئی

کسی کے حسن عالم تاب کی توریکے صدقے
کسی بدجنت کی صورت بھی پیچانی نہیں جاتی

تلش شمع سے پیدا ہے سوز ناتام اختر
خودا پی آگ میں جل جانے والے اور ہوتے ہیں

نادر موضوعات کے اشعار ملاحظہ کریں:

حسن کو پہنانا چکے جب خود نہیں کا لباس
عشق نے سر پیٹ کر پوچھا کہ یہ کیا کر دیا

تری معیاذ پوری ہوئی، اے زندگی خوش ہو
قفس ٹوٹے نہ ٹوٹے، میں بچھے آزاد کرتا ہوں

ہری چند اختر کی شاعری اور نثری تحریریں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک

ششمہ، ہی ریسیرچ اور ریفریڈ جرنل

صاحب طرز ادیب تھے مگر سمجھدی سے اگر اس جانب مائل ہوتے تو وہ ادب کے سرمائے گر انقدر اضافہ کر سکتے تھے مگر جس قدر بھی ان کی نگارشات موجود ہیں ان کی فن در قیمت بھی کمی طور کم نہیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو بجا کر کے کلیات کے شکل میں شائع کیا جائے۔ ●●●

ادب و ثقافت

معاصر تنقیدی رویے

سرپرست اعلیٰ

ڈاکٹر محمد اسلام پرویز

مدیر

پروفیسر محمد ظفر الدین

ناشر: ڈائرکٹوریٹ آف ٹرنسلیشن اینڈ پبلیکیشنز

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

چکی باولی، حیدر آباد ۲۰۰۰۳ (تلنگانہ)

9347690095

adabosaqafatmannu@gmail.com

ابوالکلام قاسمی

صفحات: ۲۸۰

قیمت: ۱۲۵ اروپے

سنہ اشاعت: ۲۰۱۹

ناشر

قومی کنسل برائے فروع اردو زبان،

نئی دہلی

جنگوں کے اثرات سے اردو شاعری کی نفسیاتی تشكیل

قاسم یعقوب

ادب کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ انسان کے ادبی اظہار کا برا محرک جنگی حالات کے اثرات ہی تھے۔ پھر حالات اپنے علاقوں چھپنے کے لیے، اپنے مرجانے والے لوگوں کے مامن، یا نئی زندگی کی تمنا کی ٹھکل میں ظاہر ہوتے۔ قلبی سچ ادب میں بڑے بڑے روز ناموں / رزمیہ معنوں کا قہقہے ہے۔ شاید یہ انسانی فس کا بے قابو نفسیاتی عمل ہو! انسانی عمل اور ادبی تبلیغی سرگرمی دونوں کے طور پر ایک بجور اور لاشوری فطری اظہار ہو!! ساجدہ زیدی نے فرانڈ کے ”ظریہ ایڈن اور ٹھیکس“ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

”توتِ حیات کی طرح خواہشِ مرگ بھی اپنے اظہار کے لیے بے شمار بالواسطہ اور علاقتی راہیں حلائش کرتی ہے۔ چنانچہ ہماری عام زندگی کے بہت سے انغال میں توستِ مرگ کی کافر مائی ہوتی ہے، جن میں قلب و غارت گری اور خودکشی سے لے کر، جا رحیت اور عام انسانیت کش روپیوں تک سب ہی شامل ہوتے ہیں..... چنانچہ جس طرح افراد کی زندگی کے بے شمار روپیے اس قوت کا اظہار ہوتے ہیں اسی طرح قوموں اور ممکنہوں کی زندگی میں بھی ہوتے ہیں۔ پروت قوموں میں جنگ، فارتِ گری اور سیاسی چارحیت کی ٹھکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ قلبِ عام، دوسرا قوموں کے حقوق غصب کرنے کی خواہش، تمامِ تم کے آلاتِ حرب کی دریافت، اور ان کی اخزوںی مزدوں، غریبین اور بے کسوں کا استعمال، حد سے سوا منافع خوری اور اپنی انجما کو مخفی کرائیشی اور پھر نئے ٹکریں آلاتِ حرب کی دریافت اور قیامت یہ ہے کہ ان کا استعمال اور ان کو نفع کے بے شمار مخفی روپیوں اور تجزیہ میں توں کا وجود آخرس چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے؟“ (۱)

گویا تاریخ اور ادب ایک دوسرے پر غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ تاریخ کا برا حصہ جنگ وجد و دل اور مختلف اقوام کا ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے واقعات پر مشتمل ہوتا ہے۔

ادب میں ”رزمیہ“ لفظِ شخصی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ رزمیہ شاعری کسی قوم کی تہذیبی روح کی امین ہوتی ہے۔ رزمیہ چھپنے کے آنکھوں دیکھے حالات کی عکاس نہیں ہوتی بلکہ اپنے اسلوب میں پروقار معنویت رکھتی ہے، جس میں کسی قوم یا ہیر و کے شجاعانہ کارناموں کو قلم بند کیا جاتا ہے اس کے بر عکس رزم نامے جنگوں، معکروں اور لڑائیوں کا بیان اظہار ہوتے ہیں۔ بنکلی بھی مظہر میں ابھرنے والی شاعری کے لیے مریش، ترند، رجز، شہر آشوب اور اسی طرح کی اور اقسام بھی پائی جاتی ہیں۔ مریشہ مرے ہوئے شخص کا اوصافی نوجہ ہوتا ہے۔ اردو

جنگ ہیش سے انسانی معاشرت کا جزو رہی ہے۔ معزکہ تحریک و شر انسانی تاریخ کے ہر دوسری میں مرکزی سرگرمی کے طور پر انسانی معاشروں میں موجود رہا ہے، البتہ اس کی نوعیت میں فرق آتا ہے۔ جنگی دور میں (جب انسان غاروں اور جنگلوں میں غیر معاشرتی زندگی کر ارہا تھا) آپس کے غیر مطلقی ترقوں میں بیاہوا تھا، تب چھوٹے چھوٹے نیادی مسائل کی عدم تکمیلیت کی بنا پر ایک دوسرے کا دشمن بن جاتا، اس دوسری میں نظریہ حیات یا نظر کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ زندگی کے بیانی دوامات کی رسائی میں جب دوسرے انسان دھن اندازی کرتا تو شدید مراجحت کا اظہار کیا جاتا جو بعض اوقات عکسکری رُؤیل میں داخل جاتا۔

رفتہ رفتہ انسان زندگی کے بارے میں واضح متوقف رکھنے لگا۔ اب لڑائی یا غلبہ پانے کی جنی آرزو، اجتماعی مقاصد کے ساتھ ہیوستہ ہو گئی۔ یہ دو روزاعت کا تھا، جو مختلف قبائل میں بنا ہوا تھا۔ ایک قبیلہ رنگ اور خون کے رشتہوں سے ایک دوسرے سے مختلف سمجھا جاتا تھا۔ ایک قبیلہ کی جنگ اپنے نامی، معاشرتی اور بھائیتی حیات کے تحفظ کے لیے لڑی جاتی۔ ایک قبیلہ کے مردمہ چاہئے ہوئے بھی اپنے قبیلہ کا ساتھ دینے کی وجہ سے دوسرے فریق یا قبیلے سے لڑتے۔ گویا ان کے نظریات کو رہنمائی ان کے اپنے خیالات یا ذاتِ حقیقت نہیں کرتی بلکہ وہ معاشرے کی ایک اکائی کے طور پر کام کر رہے ہوتے۔

زرمی دوسرے گزرنے کے بعد، صفتی دوسری میں زندگی کا رنگ ڈھنک بہت حد تک مختلف اور چھپیہ بن گیا۔ گروہ یا قبائل قوموں میں تبدیل ہوتے گئے۔ کوئی نظریہ حیات کے تابع قوم بن گئے کوئی چغرا فیالی حدود میں مست کے اپنے اپنے تحفظات کا اعلان کرنے لگے۔ مگر اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ ہر دوسری میں لڑائی انسانی معاشروں کا جزو لا یہنک بن کے مرکزی سرگرمی کے طور پر موجود ہی۔ اسی طرح ایک قوم یا گروہ دوسری قوم کے ہاتھوں نیست و ناوار ہوتا رہا۔ ایک دوسرے کے ٹکرے کے ماتحت آگیا یا غلام بننے کے مختلف طبقات میں تقسم ہو گیا۔

الہامی صحائف میں، گوک ایک قوم کی بریادی اس کی اخلاقی پختی اور احکامِ الہامی کے دیے گئے اصولوں کی نافرمانی سے ہوتی گر جہاد، جنگ اور مقامی گروہ پر غلبہ پانے کو، ہتر مل قرار دیا گیا۔ غلبہ پانے سے بہت سی طاقت ایک ساتھ دوسرس میں آ جاتی۔ یہ تبدیلی یقیناً ثابت ٹھکل میں سانس نہیں کیونکہ غلبہ پانے والی قوہ زیادہ طاقت دوسرے عاشری حوالے سے زیادہ ہے تر ہوتی یا نہیں جاتی۔ تاریخ کے صفات میں ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کے نام پر بھی غالب قوم نے ہیشہ مفتوح قوم کا پانچا چھپ اور تہذیب عطا کی۔

ادب کا تعلق بھی انسانی تہذیب کے اُن ایام سے ہے جب زبان کی تعمیر بھی اپنے تکمیلی مرحلہ میں تھی۔ گویا ادب اور جنگ ہیشہ ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں۔ دنیا کا بیشتر ادب جنگی اثرات کا براؤ راست عکاس رہا ہے بلکہ قدیم

بیوی سے مشق کی صورت میں شروع ہوتی ہے اور نو سال کے طویل عرصے کے
جاري رہتی ہے۔ اس جنگ کی فوج کے بعد جب یونانی قاتلہ داہیں آنے لگتا ہے تو
واپسی پر ”اوڈی سس“ کم ہو جاتا ہے۔ ”اوڈی سس“ کا واپس یونان تک کا سفر
کن مراحل سے نزدیک رہا، پھر قصہ ”اوڈی سس“ کا مرکزی موضوع ہے۔ وینتاکوں کا
ذکر دراصل خیروشرکی طائفوں کا ذکر ہے۔ عاد آرائی، جنی کشش اور سمندر کے پانی
پر اعصاب تکن طویل سفر ”اوڈی سس“ کو ایک سورما کے روپ میں دکھاتا ہے۔
ایلیڈ سے زیادہ اوڈی سس ”رمیہ“ مراج کی نزاکتوں اور چذباخت کو سینیہ ہوئے
ہے۔

عالیٰ ادب کے بعد جب ہم اردو شاعری کو طویل تاریخی مظہرنا سے
میں دیکھتے ہیں تو وہ ایسے بے مثال اور لا جانی ان پاروں سے محروم ہے۔ اردو
شاعری پونکہ ریشم کے اس دور میں ارتقا اور عروج حاصل کرتی ہے جب سلامان
یہاں وارد ہوتے ہیں، یہ دو طویل اور مسلسل جنگ و جدل کے باعث ہمارا مگر یہ
جمان کن بات ہے کہ اردو شاعری میں رمیہ اور زمیں ناموں کی بہت کم تعداد
سامنے آتی۔ اور جو ہے وہ لکھری اور فتحی حوالے سے اتنی شاندار نہیں کہ عالیٰ ادب کا
 حصہ بن سکے۔

اردو رمیہ شاعری کی لا زوال رمیہ نظم کی تخلیق کے بجائے محض
بدانی اور واقعیتی عکس بننی کیوں محدود رہی؟ اس کی وجہ نظر آتی ہے کہ جنگوں
کی نوبیت کی بڑے مظہرنا سے کی تبدیلی کا باعث بنشی بجائے محض انتشار، بدانی
اور اقتدار کی خود غرضہ خواہیوں تک رہی۔ نظریے کا تقدیر، درباری پچاروں کی
پلچر میں بعد، اور کسی بڑی جنگ کے واقعیتی عناصر کی عدم دستیابی بھی اس کی
وجہات ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو قوی یا لکھنی سطح کے تاثرات کوئی سطح پر احاطہ
انہار میں لا رہی تھی، جس میں درباری نظریات غلبے پاتے رہے۔ جبکہ ملاقائی
زبانی مقامی پلچر میں پیوست ہونے کی وجہ سے جزوی سطح (Micro) کے نظریات
کے تحفظ کی امین بنتی رہیں۔ وچھے صفات میں ہم علاقائی زبانوں کے ادب میں
رمیہ شاعری کی کھوج میں پہنچنے سے کھنکھنے کے لئے جنگ کی جنگ ہر
علاقائی زبان کو متاثر کرتی ہے۔ حتیٰ کہ پلچر کے نام پر نظریہ بھی تیسم ہوتا ہے، جیسا کہ
بلوچی شاعری میں نظر آتا ہے۔

جنگ میں پروان چڑھنے والے شاعر کبھی بھی اس کے اثرات سے
باہر نہیں کلک پاتے۔ یہ نفیاٹی کہیت ہر اس پہنچ کا پیدا اٹی عارضہ بن جاتی ہے جس
نے پہنچنے میں جنگ کو ترقیب سے محبوں کیا ہو۔ اردو شاعری میں دکنی عہد کے شعراء
حسن شوقي، نصرتی، مرزاقی، نعیم وغیرہ نے جنگوں کا بہت ترقیب سے مٹا دیا۔ نصرتی
کی سلطنتی دکن کے دربار میں کافی رسائی تھی، جو تمام جنگی واقعات کا چشم دیدگار
تھا۔ مبینی چجھے ہے کہ ”علیٰ نامہ“ اور ”تاریخ اسکندریہ“، دکنی عہد کے کامیاب رزم
ناول ”دوانِ جنگ“ (Farewell to Arms) میں مس بار کلے اور مصنف

کے درمیان گھنگوئیں ”مس بار کلے“ اپنے مجوب کے متعلق بتاتی ہے:

”یہ چھتری اس لر کی ہے جو چھلے سال اڑائی میں مار گیا۔“

”اوہ..... بڑی افسوس ناک بات تباہی آپ نے۔“

”مس بار کلے کہنے لگی،“ یہ بہت اچھا تھا۔ ہم دونوں کا بیاہ بھی ہو جاتا ہے

میں یہ قلم حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی الہم ناک شہادت کے واقعات
پر مشتمل ہے۔ اردو شاعری میں ڈرامائی عناصر کی آمیزش پہلی دفعہ، مریشہ کے
ذریعے آتی۔ مگر مریشہ ”ایپیک“ یا زم نامہ نہیں کہلا یا جاسکتا۔ کیوں کہ اس میں بہت
بہت محمد و دیگر رزمیہ عناصری آمیزش ہوتی ہے۔

سما (Saga) کی اصطلاح، عموماً مشتری سرمایہ کے لیے وقف
رہی۔ آئس لینڈ اور ناروے میں لکھی گئی سوانح عمر پوں اور کہانیوں کو سما کا کہا جاتا،
جس میں قوم / قبیلہ کے ہبڑو کو ان کے ساتھ قلم بند کیا جاتا۔ گویا بر
قوم کے تخلیقی ادب نے اپنے جغرافیائی اور اڑپانی حدود کے پاسانوں کو اپنے اپنے
محصول اندماز میں مخصوص ادبی ہمکوں میں خزانہ حسین چیزیں کیا، جو ”رمیہ“ کے نام
سے یادگار ہے۔ ”شہر آشوب“ اگرچہ جنگ کی نسبت ایکی کی عکاسی کرتی ہے مگر
اردو میں لکھے جانے والے شہر آشوب زیادہ تر ان سماجی حالات کے عکاس ہیں جو
 مختلف گروہوں کے درمیان ہونے والی جنگوں، جنگ پوں اور لڑائیوں کے بعد سماجی
ایکی کی صورت میں ظاہر ہوتے۔ لہذا ان کا مطالعہ بھی خطے میں ہوئی والی جنگوں
کے شاعری پر پڑنے والے اثرات کو صحیح میں مدد دے گا۔

عالیٰ ادب میں ایک نظر دوڑانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بڑے
ادب میں ”رمیہ“ موجود ہے۔ یونان میں اوڈیسی اور ایلیڈ، ایران میں شاهنامہ
فردوی، ہندوستان میں ہمہ بھارت اور رامان، انگریزی میں فیری کوئین اور
ہیراڈا ایک لاست وغیرہ۔ خیروشرکی سمر کے اور مقامی جنگ و جدل کے تاریخی تھانے
ان ”رمیوں“ میں ایسے پیوست ہیں کہ ان کے بغیر ادب کی شان و شوکت ختم ہو
کے رہ جائے۔ ان رمیہ نظلوں نے ادب کی تخلیقی جہات و حسن قدر متاثر کیا، ایسا
اڑ دیگر جنگوں میں ناپید ہے۔ لفظوں کا اختاب، خیال کی بلندی، جلوں یا صارعوں
کی بہت کشاد، المیہ، آغاز و اجام وغیرہ محض ادبی ہمکوں پا رہوں کو مالا مال نہیں کر رہے
تھے بلکہ اہم معاشرتی سرگرمی کے طور پر بھی زندہ تھے۔ مثلاً ہومر اور جول کا ادبی
کام عوام میں انجام مقول تھا۔ ہومر کی اوڈیسی اور ایلیڈ تو تخلیق کے بہت بعد
احاطہ تحریر میں لائی گئی، ایک عرصے تک یہ پیدا پہنچنے ہوئی رہیں۔

قدیم ترین رمیہ نظلوں میں ”ہما بھارت، راما ان“ اور ”اوڈیسی،
ایلیڈ“، دو علاقوں کے تہذیبی ورثے کی شاختگی بھی ہیں۔ راما نام چندرا اور سیتا
کے لازوال عشق کی داستان ہے۔ راون کی استبدادی و غل اندمازی بھی سیتا کی محبت
کو ختم یا کم نہ کر سکی۔ اس میں مشرقی عورت کی لاقانی اطاعت گزاری کا مرقع پیش کیا
گیا ہے جو اس خطے کے عوام کا آج بھی تہذیبی ورثہ ہے۔ راما نام میں قتل و غارت کا
بازار اس وقت جاتے ہے جب رام چندرا سیتا کو چھڑانے کے لیے لزکا جملہ آور ہوتا
ہے۔ پڑائی اس درجی کی عکاسی کرتی ہے جب آریا ڈنے پر رخصی میں داخل
ہو کے یہاں کے مقامی دراڑوں کو قتل کرنا شروع کر دیا اور جنوبی علاقوں کی طرف
دھکیلے میں کامیاب ہو گئے۔ ”ہما بھارت“، چوتھی بیانے ”دھرت راشٹر اور
پانڈو“ تھے۔ ان کی اولادوں کو تاریخ میں ہالتی تیپ کرواؤں اور پانڈوؤں سے یاد کیا
جاتا ہے۔ پانڈوؤں کے دیین اور حکمرانی کے اہل تھے، لہذا ایک ہی خون آپس میں
لڑنے کا کرواؤ نے پانڈوؤں پر شدید ٹلو ڈنم کیا۔

اوڈیسی اور ایلیڈ دراصل ایک ہی جنگ کی دو اقسام ہیں۔ ”ایلیڈ“، قلم
کا مرکزی قصہ ”ٹرانے“ کی جنگ پر مشتمل ہے، جو ”بنی“ کے ”بنی لوں“ کی

ورثے کے ساتھ مرکز سے غرض کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات کی علاقے کا ایمیر مرکز سے غداری کر دیتا ہے اور یوں وہ اپنی اگل سلطنت کا اعلان کر کے امور سلطنت چلانے لگتا ہے۔ یعنی مرکز اور مرکزی فکر کا تصور کمل ناپید ہے۔ پچھا اغراض اور طاقت کے رعب کے ماتحت ایران علاقے مرکزی حکومتوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس قسم کے تصور و قویت کے اردو شاعری پرشدیدار اثرات تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بالکل بدلا جاتے ہیں۔ قوم و ملخ طور پر نظریائی میادین میں تھیں ہو جاتی ہے۔ علاقے، پھر اور سیاسی اغراض پر پشت چلے جاتے ہیں۔ مسلمان اور ہندو دو قومیں بن کر سامنے آتے ہیں۔ انگریز ایک تیسا فرقہ ہے جو حاکم ہے مگر بدیکی امور سلطنت کے ساتھ و اسی تفریق رکھتا ہے۔ یوں قوم اور اس کی نظریائی بنا کو پہلی دفعہ بر صیغہ میں اجرا کیا گیا۔ اس ساری صورت حال کو اردو شاعری نے نظریائی مقدمہ بن کر پیش کیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے حوالے سے اردو شاعری انگریز سے فرقہ کا اعلان کرتی ہے۔ یعنی تہذیب اور نئے مغل و احاس کی اور دیوبندی ہے۔ سریسے تحریک کے زیر اثر شاعری کوکل ایک تو اعادے کے نکال کے عواید اظہار کے قریب لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سریسے تحریک کی حق پرستی اور حقیقت نگاری (Realism) سماجی انتشار کو نئے زاویے سے دکھانے اور سوچنے کا انداز دیتی ہے۔

دوسری طرف پاکستانی علاقائی زبانوں میں اردو سے قدرے مختلف رسمیہ نظموں کا سارا غلبہ ہے۔ شاعر اپنے پھرے سے مقامی سُنگ سے اس قدر جڑا ہوا ہے کہ وہ ثابت میں موجود قدروں کے بغیر نہ کی اتصاف نہیں کر سکتا۔ مخالفی زندہ شاعری میں راجہ جنگل کی داستان ہندو مسلم زدائع کی بجائے غیرت کے نام پر تربیتی کی کہانی ہے۔ راجہ جنگل کی بیٹی سے جب اکبر پادشاہ شادی کی فرمائش کرتا ہے تو راجہ جنگل سُنگ پا جو جاتا ہے اور اس سے اس بے غیرتی کا بدله لینے کے لیے لڑنے کا عہد کرتا ہے۔ راجہ کے ساتھ اس کا بھائی فوج جنگ بھی اُس کا ساتھ دیتا ہے اور لڑتے لڑتے، اکبر کے خلاف شدید فرقہ کا اظہار کرتے ہوئے، دوںوں بھائی جان دے دیتے ہیں۔

راجہ جنگل اکبر کو کہتا ہے کہ ”کیا تم نہیں جانتے کہ ہم ہندو ہیں اور تم مسلمان۔ ہمارا تمہارا زمین آسمان کا فرق ہے۔“ یہ فرق کوئی نظریائی فرق نہیں بلکہ اس کے پیچھوں و علاقائی غیرت کا جذبہ پہنان ہے۔ اکبر پادشاہ نے تاریخ کر دیا ہے۔ دوںوں بھائی اسی پھر کو پھانے کے لیے جان کی بازی ہار دیتے ہیں۔

مخالفی کی دوسری ”واروں“، جن میں ”ڈلہ بھٹی“ بہت مشہور ہے، میں بھی مقامی ثافت خیالی صورت انداز سے جلوہ گر ہے۔ چٹو، سندھی اور بلوچی شاعری میں قائلی پھر نہیں ہے۔ اپنے قیلی کی سُنگ کے لیے شاعر نظموں کی تمام شان و شوکت کمال فتح حرسرے جوڑتا ہے۔ مقامی شافتون کا اظہار جیسے بدے کی روایت، قول نہمانے کی روایت، مہماں نوازی، دشمن سے سلوک، بہادری کے اوصاف، سورماؤں کا مرتبہ وغیرہ، بخاریانی خدوخال کے ساتھ نظموں میں جگہ باتاتے ہیں۔ علاقائی زبانوں کا جگل ادب پڑھتے ہوئے ہم شافتون کی خوبصورت قدروں اور رسم درواجن کا بھی ذائقہ محسوس کرتے ہیں، جن کی گلاؤٹ سے جنگی واقعات، بیرون کا مقام اور نظموں کی فتح کا دراکھ محسور کن کیفیات کو ہم دیتا ہے۔ مقامی زبانوں کا رسمیہ ادب آج بھی دیہاتوں کی چوپالوں میں گاکے سنایا

لیکن سوئے کی لڑائی نے اسے مجھ سے چھین لیا۔“
وہ کہنے لگی،

”انگلی میں نے سلیویں سال میں قدم رکھا ہی تھا کہ میں نے نرسگ شروع کر دی۔ اس نے اور میں نے اکٹھے کام شروع کیا تھا۔ مجھے یاد ہے ان دنوں میں ایک بڑے احتجاجی خیال کو پالا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے ہپتال میں آئے گا۔ میں سوچی تھی کہ اس کے ماتھے پر توار کا زخم ہو گا اور پانی بندی ہو گی۔ کبھی بھی پر خیال پچھل جنمیں ہو جاتا اور میں سوچتے تھی کہ اس کے کندھے میں گولی تھی ہے اور میں اس کے سر ہانے پیش کر رہا ہم پی کر رہی ہوں۔ آپ ایسے تصورات سے واقع ہیں؟ پچھلے لاپیز رو جانی کی چیز.....“ (۲)

جنگ کے اڑات کس طرح غیر شعوری طور پر حقیقت سے خوابوں تک کا سفر کر جاتے ہیں، ”مس بارکے“ مکمل طور پر جنگ کے زیر اڑا ہے۔ بھی وجہ ہے کہ اُس کی محبت بھی بارو بھرے جذبات سے نیز ہے۔ بھی صرفتی نے جنگ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ صرفتی کی شاعرائی فنی جماليات نے اُس کی مشنویوں ”علی نامہ“ اور ”تاریخ اسکندری“ میں جو ہر دکھائے ہیں۔ دکن میں بہت سے شاعروں سے رزمیہ مشنویاں منسوب ہیں مگر کوئی مشنوی بھی کسی بڑے رزمیہ موضوع کو سینہ ہوئے نظر نہیں آئی۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کی عکس بندی دربارے مسلک ہونے کی وجہ سے ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات شاعروں کا باشناش آتی کہ فلاں جنگ کا احوال لکھو۔ پکاری مشنویاں بھی ملتی ہیں جذبات کی آسودگی کے لیے لکھی گئیں، جنہیں رہائی مشنویاں کہا جا سکتا ہے۔ حضرت علیؑ اور حضرت امام حسنؑ سے والہانہ عقیدت کو ان مشنویوں کا موضوع بنا یا جاتا۔ ”خاور نامہ“ اور ”ازر تھی ایسی ہی ایک طویل اور دوڑھنیات سے بھر پور مشنوی ہے۔ دکن کے بعد اردو شاعری کی تو اناروایت جب شال کی طرف ہجرت کرتی ہے تو ہمایاں انتشار اور بدآمی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اور گنگ زب عالمگیری کی دفات (۷۰۰ میلے) کے بعد پورے بر صیغہ کا سایی نقشہ بدلا جاتا ہے اور دیکھتے ہیں۔ اس خطے میں قتل و غارت کا بازار گرم ہو جاتا ہے جو انگریزوں کے بر صیغہ پر کمل غلبے تک جاری رہتا ہے۔

۷۰۰ کے اسے لے کر ۱۸۵۷ء کے ایک طویل دوڑھے جس میں جنگ (War) کا تصور (Concept) تو مکمل طور پر نظموں آتا تھا جھٹپٹیں، بڑائیاں اور محلوں کی کثرت جنگی فضا ضرور تیار کر دیتے ہیں۔ شال میں چھوٹی چھوٹی تہذیبیں مکھری ہوئی اپنے مخصوص علاقوں میں محدود ہیں، لہذا اردو شاعری کے موضوعات بھی مخصوص عسکری واقعات کو پیش کر رہے ہیں۔ شہر اشو، جہو نگاری، حکومتی انتظامات پر طبلہ، ناپسیداری، بے سکونی، انتشار اور اس قسم کے دیگر کی موضوعات ان ڈیڑھ سو سالوں کے محبوب موضوع ہیں۔ اس میں کوئی جنگ نہیں کہ اس پوری فضائے رزمیہ نظموں کی تخلیق میں تو مدودی مگر اضطراب، هکست آرزو جیسے موضوعات اپنی مخصوص فضا اور منتخب شدہ الفاظ (Dictionary) کے ساتھ اردو شاعری کا حصہ بنے۔

یہاں یہ بات قابلی توجہ ہے کہ ملیخہ عہد میں قویت کا مجھی قصور ناپید ہے۔ بر صیغہ بھر کے نواب اپنے اپنے علاقوں کے سیاسی، معاشری اور شاہق

وقت ذواللقار علی بھٹو کے پاس تھی، اس سانچے کا ذمہ دار تھا بھٹاکیا گیا۔ ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء کی بیانوں کے پس مظہر میں تختیش شدہ اردو ادب کی بڑی گلری تحریک کو حتم دینے سے قاصر نظر آتا ہے۔ ادبی طلب پر بھی ان نظموں کی فنی حیثیت بہت کم زور اور جالیتی پنجھی سے عاری و لکھائی دیتی ہے۔ لہذا یہاں کسی بڑے روز ناتے اور زمیں کی تختیش کی طلاش کا عرصہ ہے۔

پاکستانی اردو شعر نے دنیا کے دیگر ممالک کے درمیان چھڑی جنگوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس سلسلے میں تقریباً ہر دور کے ہر قابلیت کو کشاور عکس کے ہاں کسی نہ کسی جگ پر ادنی اظہار فوجی میراثی میں نظر آتا ہے۔ خصوصاً افغان امریکہ کے جگ اور عراق امریکہ بیگ، جوالہ ہی میں انسانیت کی مناظر کے ساتھ وقوع پر ہوئیں، ابھی تک ہمارے شہرا کے اعصاب پر چھائی ہوئی ہیں۔ تمل کی طلاش میں کس طرح تیز منڈیوں تک رسائی حاصل کرنے کا مقصود بنا یا گیا، غریب اور زندگی کی بیوادی قدروں سے محروم گوہوں اور پاروں کے خلاف کے شے کے کر ان کی زندگیوں کے چڑائیں گل کے گئے۔ عراق اور افغانستان گوشہ چھ، سات سالوں سے امریکی چارجت کا شکار چلے آ رہے ہیں۔ ان جنگوں کے خلاف دنیا بھر سے نفرت بھرے چذبات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ دنیا بھر کے ادب میں ان غیر انسانی کارروائیوں کے خلاف لکھا گیا۔ ہیرلٹھ میٹر (نوبل انعام ۲۰۰۵ء) نے اپنی ٹھیکنی نظموں کی کتاب ”جنگ“ (War) میں امریکی اور اس کے اخداویوں کو شدید تھیکانہ بنایا۔

جنگ اور زندگی کی خواہش دو ایسی سرحدی ہیں جن کی تیشیم خون کی ندی کرتی ہے۔ آج کے دور میں جنگ نے ہماری زندگیوں کو تیری ان کی حد تک متاثر کیا ہے۔ ہمارے شب و روز، ہماری اقتصادیات اور ہماری زبان تک جنگ اور اس کے ضمائر اڑات سے بچنی پاپی۔ ادب کا بڑا حصہ بھی برداشت اور بالواسطہ جنگ سے اثر انداز ہو رہا ہے۔ یہاں کمبل کوہن کا ایک مذرا درج پر مضمون ”عسکری اصلاحات اور جنیات“ جس کا اردو ترجمہ مسحود اشعر نے کیا ہے، کا حالہ دیتا ہے جانہ ہوگا:

”وزمرہ کی زبان استعمال کر کے خود جنگی مہریں بھی اپنی زندگی کو خوش گوارہ بانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی ہیڈیوں کو بلا اجازت چھوڑنے کے لیے جو ایکٹر امک سٹم بنا لیا گیا اس کا پیارا نام رکھا ہے۔ PAL یعنی دوست اپنی بلیکٹ میرا میں سٹم کے لیے ابتداء میں جنم رکھاتا اس کا نام“ بھی“ تھا۔ صدر کی طرف سے ہر سال اپنی تھیکاروں کی تیاری کے لیے جو منصوبہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور کیا بانٹا ہے اور کس تعداد میں بناتا ہے؟ اسے“ شاپنگ لسٹ“ کہا جاتا ہے۔ یعنی خرید کی جانے والی اشیاء کی فہرست۔ جب اپنی تھیکاروں کے نشانے طے کئے جاتے ہیں تو پیش کیا ہے اسی تھاری کی“ میمیو“ سے اس کا تھیکار کرتی ہے۔ ایک خاص اپنی حملے کا نام“ بیکٹ کائنے والا آل“ رکھا گیا ہے۔ ملک دفاع نیشنن بم کے لیے بھی یہی لفظ استعمال کرتا ہے۔ ان الفاظ اور ان استعمالوں سے انسانی زندگی اور انسانی جانوں کی طرف بھی توجہ ہٹ جاتی ہے۔“ (۳)

یہ بڑی خوش آئندہ بات ہے کہ آج کا شاعر حالات کو سمجھتا ہے۔ نظریہ اور نظریاتی مہم کو جانتا ہے۔ وہ سرحدوں سے پار جا کر انسانیت کی حیات کرتا ہے،

جاتا ہے۔ ہر نسل اس ورنے کو پہلی نسل سے سیندہ بہ سیندہ وصول کرتی آرتی ہے۔

اردو کے تاریخی مطالعے کے بعد جب ہم پاکستانی دور میں پہنچتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے وقت جس قومیت کا احساس پرے بر صغیر کے عالم کو ہوا تھا بس میں ہندو اور مسلم و قوموں کے احساس نے پورے خط کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی تھیں کے بعد بھی احساس اب جغرافیائی حدود کے تحفظ کے نئے احساس کی آمیزش سے ظاہر ہوتا ہے۔ دو قومیں دو ملکوں میں تھیں ہو ہو ہی تھیں۔ دونوں ممالک کے درمیان دو خون ریز جنگوں نے نظر پریں اور جغرافیائی پھر کے نئے احساس کو شدید رضیں لائیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا شاعر اب اسی احساس کے ساتھ شاعری تھیں کرتا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے پس مظہر میں جس طرح دشمن پر غلبہ پانے کی آرزو اردو پاکستانی شاعری کی نظموں / غزوں میں موجود ہے، اس طرح کامنا ادا اس سے پہلے موجود ہیں تھا۔

بھی ترانے، عسکری فتوحات، چادر کے تھرے اور مددی میں مشاہیر کی یادیں ہر شاعر کے ہاں نظر آتی ہیں۔ گیا مشترکہ کلچر، ثقافت اور اس میر کے پس مظہری حرکات کو درخواست اتنا نہ کھجایا۔ ہر حال میں غلبہ ہی نظموں کا مرکزی موضوع نظر آتا ہے۔ چونکہ یہ سارا ادب ہنگامی اور قومی نوعیت کا تھا اس لیے نظموں کی فنی حیثیت ہمیشہ ٹھیکنے پر مجبور کے استعمال کی طرح پکھد رہی تھی۔

۱۹۷۶ء کی جنگ دراصل طویل عرصے تک پھیلی وہ صورت حال تھی

جس میں ایک دفعہ پھر زبان، پلچر اور جغرافیائی سماں میں کے مباحث چھڑ گئے تھے جو رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے اس نجی پر آگئے کہ ”اُنھم اور اُنھم“ یعنی نظرے دو حصوں کو دو ملکوں میں تقسیم کرنے پر تیار ہو گئے۔ اس سلسلے میں ہماری سیاسی قیادت (جو فوجی و روری میں تھی) پورے معاملے کو پہنچنے میں ناکام رہی۔ پول ملک دو ملکوں میں تقسیم ہو گیا۔ یہ مخفی سیاسی جنگ نہیں تھی بلکہ ایک اعصاب شکلی عرصے سے گزر کے پر سانحہ تکمیل ہوا۔ پاکستان، جوشتری اور مغربی حصوں پر مشتمل تھا، بھارت کے ساتھ کی روشنک مرکز آرائی میں مشغول رہا۔ بھارتی افواج نے شہروں پر گولے برسانے اور ہر دو قدم اٹھایا جو کہ جنگ میں ناگزیر عملیں بن جاتا ہے۔

جب ہم اردو شاعری کے اس دور کا مطالعہ کرتے ہیں تو شاعریک دفعہ پھر جنگ اور اس سے پیدا شدہ صورت حال کا مشاہدہ کرنے کی بجائے نظری جذبات کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ حکر انوں نے بیکار دشیں کے قیام کو سقط کا نام دیا۔ بیگانوں کی سازشوں اور بھارتیوں کی عسکری مداخلت کو اس کا موردا لامٹھرا یا اور ”جو ہوا سوہوا“ کہہ کے نئے عنیم اور نئی تو نانیوں کے ساتھی زندگی کے آغاز کا خواب دکھایا گیا۔ اردو شاعری میں انہی خیالات کی گوئی ملتی ہے۔ شعرانے اس پوری فضا کا ایک افسوس ناک کیفیت سے آگے بڑھ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس فضا سے نکلنے کے لیے نئے عنیم کی تیز کاروں دیا گیا۔ گویا جو مملکت کے مقاصد تھے وہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی دونوں بیکاریں میں شرعاً نے پورے کئے، اپنا نظریہ (Stance) کہیں نظر نہیں آتا۔ ۱۹۷۱ء کے حوالے سے کچھ شعرانے جملی واقعات کو بھی مظہر کیا ہے۔ مگر وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ قیدیوں کی واپسی کے لیے دعا کیں مانگی جارہی تھیں اور ان کی وطن واپسی پر جذباتی اور سے خیالات سے مغلوب نظموں کے انبار لگائیے گئے۔ اسی ناظر میں پچھے شعرانے شدید روزگاری کا اظہار کیا۔ فوجی حکر انوں کو شدید تھیکانہ بنایا گیا۔ سیاسی قیادت کو بھی، جو اس

ہوا۔ اس حوالے سے ابھی بہت کام کی گنجائش موجود ہے۔ اردو شعرانے خاص کر پاکستانی دور میں ملک سے باہر دوسرے ممالک کے درمیان بیکوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو یقیناً غیر جانبدار اور خالص نظریہ انسان دوستی پر ہے۔ فیض صاحب، قائدِ صاحب اور دیگر ترقی پرند شعرانے فلسطینیوں لی جمیعت میں اسرائیلی جاریت کو تقدیم کا شاہد ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ صرف مسلم ممالک پر مستطیل کی گئی جگتوں پر پاکستانی شعرانے روشن کا اظہار کیا مگر تو یہ کی دہائی میں یہ سورت حال سکر تبدیل ہو گئی۔ کوکاب بھی مسلمان یعنی صیہونی طاقتوں کا شاذ بن رہے ہیں مگر مظلومیت ہر حال ایسا مظہر ضرور ہے جس نے کمزور اور طاقت ور میں کمزور کا ساتھ دیتے کا پذیر ہے۔ آج صرف مسلمان یعنی عراق، افغانستان، فلسطین اور لبنان میں جاری سامرای طاقتوں کی جگہ کے خلاف نہیں بلکہ ہر ذی شعور داش ور کا احتجاج اس کا گواہ ہے کہ شاعر اور شاعری کا نہ بہب صرف انسان دوست اور انسانیت کا درس ہوتا ہے۔ جگ خواہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہی کیوں نہ ہو، انسانیت کش اور نفرت آمیز انسانی رویہ ہے، جو یہاں نیت (Brutality) کے قریب تر ہے۔ اس کا استعمال بڑوں عمل ہے جو کسی طرح بھی نہیں ہوتا چاہیے۔ اس کی انتہا جات کے طور پر پاکستانی اردو شاعر اکابر کا مرکزی موضوع رہا۔

۱۔ فرانڈ کا نظریہ شخصیت: ساجدہ زیدی، مشمولہ "شخصیت کے نظریات" ،

ترقی اردو پیور، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء، ص ۲۲۳۔

۲۔ وداع جنگ (ترجمہ: احسان احمد)، سگب میل پبلشرز، ۲۰۰۰ء، ص ۲۳۶۔

۳۔ زبانِ خلق سے زبانِ حال تک: کیم کوہن: مرتب: بکشور ناہید، مشمولہ مضمون "عورت": سگب میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۰۔

۴۔ زمین کا نوحہ: (مرتب: ٹیکری یازدی)، بہرزاد کراچی، ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۲۶۔

● ●

خطے کے سیاسی مقاصد کو بھانے کی خاطر حکمراں کا آکر کا رہنے بتا۔ اپنے شاعر ہونے کا بنیادی فرضیہ ادا کرتا ہے۔ محبت، امن، زندگی اور انسانیت اُس کے "نموب" کے بنیادی عناصر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نظریہ (Stance) کا اعلان انہی قدر میں کی پاسداری کے لیے کرتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ قوانین انسانیت (Humanitarian Laws) ہر جگہ ایک سے ہیں، جو فرانڈی یا نظریاتی حد بندی سے ماوراء ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ "بہرزاد" کراچی سے چھپنے والی ایک کتاب "زمین کا نوحہ" بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کا موضوع ایٹھم کی جاہ کاریوں پر کھانا جانے والا ادب ہے۔ کتاب کے مرتب ٹھیکر یازدی نے مختلف انسانیوں اور شاعروں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اردو شاعری کی جگ کے مختلف مجموی سوچ کو پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب پاکستان کے ایٹھم دھماکوں کے ٹھیک دوسال ۲۰۰۰ء کو شائع کی گئی۔ یہ ایک قلم کا اس اقدام کے خلاف احتجاج بھی تھا۔ جگ کے خلاف عمومی رؤویوں میں افسانہ کاروں میں آصف فخری، انتشار حسین، بین مرتزہ، امر جمل، مسعود اصغر زادہ، حامی ہمیں ارجمند، حسن مظفر وغیرہ نے فلشن میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ شاعروں میں احمد فراز، حسن بھوپالی، انور حسن صدیقی، کشورناہید، فہیدہ ریاض، حسن عابدی، بلال نقوی، ان۔ مداش، ذیشان ساحل، علی محمد فرشی، شیراز زادہ، حن زادہ حسن اور حارث طیق وغیرہ نے ایٹھم کے خلاف روپ عمل ظاہر کرتے ہوئے انسانیت کے لیے جگ سے آزاد معاشرے کے خواب بنتے۔ زادہ حسن کی ایک نظریہ "جگ کی کوکھ سے جنمی نظم" جگ اور خوف کے درمیان سانش لیتیں زندگی کی عکاسی کرتی ہے:

میں نے پوچھا اس سے، اس کے شہر اور شہر میں آباد لوگوں کے بارے میں
میں نے پوچھا اس سے بارش، ہوا اور گلوں کے بارے میں
میں نے پوچھا اس سے اس کے جیون اور جیون میں رچے دھکوں کے
بارے میں

میں نے پوچھا اس سے شہر کی بے سود بیتی ٹھیکر
اور جچھے برس چڑھی بیکوں کے بارے میں
میں نے پوچھا اس سے میک اپ کی دکانوں، رنگ برلنگے کپڑوں
اور لڑکوں کے بارے میں

میں نے اس سے نیلے سمندروں، دکھتے صحراؤں
اور گہرے جگنوں کے بارے میں پوچھا

میں نے اس سے ہر اس شے کے بارے میں پوچھا
جو ہمارے ماضی میں آباد نیا کا

بہت عرصے تک خواب بھی رہی
اس نے بیرے و جوڑوٹوں کے دیکھا

اور میرے سینے سے لگ کر رونے لگی (۲)

ای تسلسل کا اردو شاعری میں اگلا پڑا وہ میں عراق اور افغانستان پر امریکی اور اُس کے اتحادیوں کے جملے کے بعد شعرا کے ہاں اظہار کی شکل میں ملتا ہے۔ بہت خوبصورت اور زندہ رہنے والی نظریں لکھی گئیں۔ اردو شاعری میں نظریہ انسان دوستی نے کروٹ بدی اور اپنی اصلی حالت میں آنے میں کامیاب

ایک لفظ کی موت

(صادق کی تجرباتی کہانیاں)

مصنف: پروفیسر صادق

ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر عشرت ناہید

9598987727

تیمت: ۵۰۰ روپے

PUBLISHER

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE, DELHI

011 23216162

اردو ادب کا شاید ہی کوئی قاری یا طالب علم ایسا ہو جو صادق کی شخصیت اور کارناموں سے متعارف نہ ہو۔ پروفیسر صادق کی معنوں میں متنوع صفات کی حامل شخصیت ہیں۔ وہ بیک وقت اردو اور ہندی کے مقبول شاعر، نقاد اور مزاح نگار ہیں۔ اس کے علاوہ ڈراماتوگی اور فنِ مصوری میں بھی اُنھیں کمال کا جو ہر حاصل ہے۔ صادق کو زبان، علم، فن، ادب اور آرٹ برکاتِ عبور ہے۔ اتنا ہی نہیں موصوف برسوں تک ملک کی کمی بڑی تعلیمی دانش گاہوں میں درس و تدریس کے فرائض انعام دے چکے ہیں جس میں وہی یونیورسٹی بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے جس طرح ایک قلم کار کی حیثیت سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اپنے تخلیقی اظہار اور فنِ جو ہر کے گھرے نقش چھوڑے ہیں اسی طرح ایک استاد کے بطور بھی انھوں نے اپنے فرائضِ اسن طریقے سے بھائے ہیں۔ صادق کی اردو میں اب تک بیکھنے کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو مختلف انواع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اردو کا کوئی اہم موضوع ان سے اچھوٹا نہیں رہا۔ انھوں نے شاعری (غزل، نظم)، پروڈی، مزاح، حقیقت، تقدیر، ڈراما اور افسانہ وغیرہ میں کارہائے نمایاں انعام دیے ہیں۔ علاوہ ازیں پروفیسر موصوف اردو زبان کے علاقے سے کئی ڈاکٹریٹیں بھی بنا چکے ہیں۔ اردو، ہندی، فارسی، مرathi، سنسکرت، سندھی، پنجابی اور سرائیکی زبانوں کے سینمازوں میں انھوں نے کئی پیچر دیے ہیں۔ صادق نوکرہ زبانوں کے ادب سے خصوصی وچکی رکھتے ہیں جس کی جملک ان کی تخلیقات میں بھی صاف نظر آتی ہے۔ خصوصاً ہندی، فارسی اور سنسکرت الفاظ کی آویز و آمیزش سے ان کی تحریریں معنی آفرینی سے لبریز ہیں۔ اعزازات و اعیامات کی بھی انھوں نے پرواد کی اور نہ ہی بھی اس کی جاہ رکھی بلکہ ہمیشہ ہمہ تن مغلیمی کے ساتھ اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔ مجھی طور پر صادق کی ادبی خدمات قبل قدر ہیں جس پر جتنی خامہ فرمائی کی جائے کم ہے۔

نئی نسل کے ہونہار ادیب، مدیر اور ناقد غلام نبی کمار کے مضمون صادق کے تجرباتی افسانے سے ماغز

7053562468, kumarnabi.gnk@gmail.com

مرقع شہپر رسول

ڈاکٹر عادل حیات

گھرائیوں میں کچھ سربراہتی ہوئی۔ اسی زمانے میں ان کی ایک غزل نے خوب دعوم چاپی:

کوئی سایہ نہ کوئی ہم سالیا آب و دانہ یہ کس جگہ لایا
دوسٹ بھی میرے اونچے تھے اک مخالف بہت پسند آیا
خیر ایک ہم کے تخت کرے کی خلاش شروع ہوئی۔ اللہ اللہ کر کے دفعت تام ذا کرگر
میں کرہل ہی گیا۔ شہپر صاحب اپنے سوت کیس کے ساتھ کرائے کے کرے میں
نخل ہو گئے۔ میرے ایک دوست کے مطابق وہ کرمہ نہیں بلکہ ایک اسی قدر بھی، جس
میں چوکٹ لگا کر سال خوردہ لو ہے کے قبضے دروازے جڑ دیے گئے ہیں تاکہ اس
میں رہنے والی مخلوق کی آمد و رفت میں آسانی ہو سکے۔ یہ مخل جل بھیں بلکہ حقیقت بھی
ہے کہ جس کرے میں شہپر رسول ابتدا قیام پذیر ہوئے تھے وہ گلی اور خانی سے کئی
فت گرا تھا۔ اس میں دھوپ جانی تھی اور نہ ہوا کا گزیری مکن تھا۔ میں ان چونجی بومراج
پوچھ لگتی تھی۔ مغرب کی اذان کے بعد لوگ مسجد کی طرف جاتے ہیں، لیکن یہ معمول
تمہارے میں گھر سے لکھا اور بازار سے کوئی چیز نہ پوتا ہو شہپر صاحب کے کرے کو کھجہ بنا
لیتا۔ وہاں پہلے سے کئی لوگ موجود ہوتے، ان کے ساتھ خش گپیاں کرتے ہوئے
کرے میں بھیلیں کی بوكا حساس ہی نہیں ہوتا۔ اس درمیان علی ٹرکھ کا دکر کلک آتا
اور رات کافی سے زیادہ ہوجاتی۔ کبھی ان کے کرے کی طرف جاتا تو کیلے کی تاب
کے اواراق کو لئے پلتے نظر آتے۔ یہ موقع اچھا ہوتا۔ میں جھٹ سے اپنی غزل کمال کر
ان کے سامنے پھیلا دیتا اور وہ اصلاح کرتے ہوئے سپنوں کی دنیا کی سیر کرنے
لگتے۔

میں بھی کہاں کی لے کر بیٹھ گیا۔ اچھا جعلے چھوڑ دیے ان باتوں کو آپ تو
پروفیسر شہپر رسول سے اپنی طرح واقف ہوں گے۔ کیا کہا واقف ہیں اور آپ
صاحب نہیں۔ اچھا تو میں پہلے ان کا حلیہ ہی بیان کر دتا ہوں۔ آپ کو اکتنی سُم
کے سوت بوث میں بیوں اپنی باتوں پر مہذب تھیں لگتا اور دوروں لوگی بیٹھنے پر مجبور
کرتا ہوا کوئی شخص نظر آرائے تو بھج جیجے کہ وہی شہپر صاحب ہیں۔ اداہ اچھا غالباً کہنا
چاہتے ہیں کہ آپ اس طیہ کئی لوگوں سے واقف ہیں۔ جلد آپ کی بات مان لیتا
ہوں، لیکن موزوں و مقابہ اعضا و نتوش کا حال ایسا یہ مخل کہاں ملے گا، جس کی
مشہب کسی دیدوار سے دی جاسکے اور نہ سرسک کے ان محظوں سے جن کا پستہ قد
تماشائیوں کو ہنسانے کے کام آتا ہے۔ وہ اپنے مخل ہے، جس کا سرپاہیں دیکھنے سے
تلخ رکتا ہے۔ جامت کے میں مطابق ہاتھ پاؤں، پیٹ اپنی مناسب جگہ پر چوڑا
چکلا سینہ اور جسم کے تقاضوں کا ساتھ دینا ہوا خوبصورت پھر۔ پھر کے کی گلابی زمین پر
دوستے پتے ہوئے، اس کے اوپر سلیٹے سے کتری ہوئی موجہ ہیں۔ ٹکا اسٹچاپ کو درا
اوچی کریں تو تیخ طردار جیسی ناک اور اس کے دونوں طرف باداں آنکھیں، جن پر
سامبان کی مانندی ہوئی بھوئیں خوبصورت نثارہ پیش کرتی ہیں۔ اس خوبصورتی میں

میرا حال ماضی کے مضبوط ستوں پر کہا ہوا ہے، جس میں یادوں ایسوں
کی طرح مدوسال کے مصالحے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان یادوں کے بارے میں
سوچتے ہوئے پھرے پر کہنا کی کی دیہنیں بھی جمعی پیں اور نیت خوٹکار جیزوں
سے بھی گرنا ہوتا ہے۔ اس وقت ہن کا سفید پر دوہ کس روپ ہو جاتا ہے۔ ان میں
سے کچھ عکس پچان میں نہیں آتے اور کی ایسے ہوتے ہیں، جن کا شعار ہی گدگار
محدود ہو جانا ہوتا ہے۔ میں اس معاملے میں خوش قسمت ہوں کہ ہن کی سطح پر
اہمتر ڈوبتے عکسوں میں سے کئی حال کی کڑی ڈھپ میں گھٹے سائے کے مانند
دھکائی دیتے ہیں۔ ان کے سائے میں شب و روز کرتا ہوا میں انہیں اپنے لیے رہت
تصور کرتا ہوں۔ ان میں ایک ایسا عکس بھی ہے، جو چیل کی دنیا کی سیر رکھتا ہوا مجھے نہ
جانے کسی بھی جرتوں اور سرتوں سے دچار رکتا ہے۔ وہ مغلق لوگوں کے لیے
الگ الگ چیزیں رکھتا ہے، لیکن چہار دنگ عالم میں شہپر رسول کے نام سے مقبول
ہے۔

یہ 1993 کی ایک شوخ صحیح۔ میں پروفیسر خالد محمد کو اپنی غزل
دکھارہ تھا اور دوچار کر سیں کے فاصلے پر شہپر صاحب بیٹھے متواتر پہلو بدل رہے
تھے۔ میں چورگا ہوں سے ان کی طرف دیکھتا اور اپنی نظریں پیچ کر لیتا۔ ہوا یہ کہ
شعبہ اردو کے نوار طبلہ و طالبات کے لیے "استقلالیہ" تقریب کا انعقاد ہونا تھا۔
استقلالیہ کے دوران شعبے کے طلباء پر تھیات پیش کرتے تھے۔ چونکہ میں بھی
بندی کر لیتا تھا اور میری غربیں ہندوپاک کے کئی رسالوں میں چھپ چکی تھیں، اس
لیے مجھے بھی غزل نامنے کا موقع دیا گیا۔ میں نے غزل بھی اور استقلالیہ تقریب
سے دوچار دن پہلے ہی شہپر صاحب سے اصلاح لے لی۔ اس تقریب سے ایک دن
پہلے صدر شعبہ، پروفیسر عنوان چشتی صاحب نے حکم صادر فرمایا کہ اس انتدہ ڈن واپی
تھیات دکھادیں۔ میں بھی طوہما کر آؤں کے ساتھ لامن میں لگ گیا اور اپنی
باری کا انتظار کرنے لگا۔ اندر کرے میں دیگر اساتذہ کے ساتھ شہپر صاحب بھی
بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے نام کا قرضھلا تو سامنے پروفیسر خالد محمد نظر آئے۔ اس
واقعہ کے بعد ملقات کی سعادت حاصل ہوئی تو شہپر صاحب کی آنکھوں میں
نار اُنگی کے آثار دکھائی دیے اور شہی ہونٹوں پر ٹکایت کی بر بھی ڈھونڈنے سے
ملی۔ جس سے مجھے حوصلہ طا اور میں ان کے قریب ہوتا چلا گیا۔ یہ زمانہ تھا جب
شہپر صاحب گیٹ فیلٹی کے طور پر شہے سے واپسی تھے جو کہ مستقل ہونے تھی
1994 نکٹ جاری رہا۔ شعبہ اردو میں لپھر کی جیشت سے ان کا تقرر ہوا تو کئی
مسائل بھی آنکھے ہوئے۔ ایک مسئلہ تو رہنے کا تھا، جسے ان کے ایک رشتہ دار
نے حل کر دیا اور شہپر صاحب اپنا سامان جو کہ ایک سوت کیس کی صورت میں تھا،
ہاتھوں میں اٹھائے وہاں پہنچ گئے، لیکن کچھی دنوں کے بعد اڑتی ہوئی خبر آئی کہ
شہپر صاحب رہنے کے لیے کرہ تلاش رہے ہیں۔ میں چونکا اور ساعت کی اتحاد

تو اسح میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔ تو کرچا کر اندر ونی و پیر و فی انتظام و اصرام کے فرائض انجام دیتے۔ اسی محل میں چودھری وجیہ الدین نے بزرگوں کی الگیاں پکڑ کر یا اون پاکیں چنان سیکھا اور ان کے جملوں کو دہراتے ہوئے اشیائے دنیاوی کو ان کے حقیقی ناموں سے جاننا بچانا شروع کیا۔ قوت اور اک نے جلپاپی تو آموزش گاہ ان کی تعلیم و تربیت کا مسکن بنی۔ ذہن کی کشادگی کے ساتھ تلقینی مدارج کو ترتیب ہوئے آٹھوں تک پہنچے۔ اس کے بعد علی گڑھ چلے گئے، لیکن یہاں کی فضا میں طبع رواں کوئی نہ کرنے کے لیے کافی تھیں، چنانچہ جیسے گئے تھے، ویسے ہی پیرگ وابہن آگئے۔ ترددی ہکل پیدا ہوئی، والدین بگر کوشے تو ہر علم کا مشاق غوط خور پہنچا ہے تھے، ان کے ذہن میں لکھنوتی پی تہذیبی شاخت کے ساتھ جگایا اور چودھری وجیہ الدین دہان کے گلی کو پہنچ کی سیر کرتے اور اکانہ اسلامی مذکرا ج تک پہنچ گئے۔ سادگی اور "دارالشنا" سے گرفتے ہوئے امیرالدولہ اسلامیہ مذکرا ج تک پہنچ گئے۔

قشع میں اللہ واسطے کا پیر ہوتا ہے۔ یہاں بھی وہی طرف تماش ہوا اور سلاست و سادگی نے اس مصرع کو پڑھتے ہوئے "اللہ کس بل میں گرفتار ہو گی" اتنی راہیں اگل کر لیں۔ ایک مرتبہ پھر وہی مٹی کی خوببو، درخنوں کی ہریالی، برگ، لکھ پھول پھل، شناساچرے اور رنگوں کی دھڑکاں اور اس طرف میں کھڑی ہوئی ملیں تو فیصلہ کیا کر ما جول کی شناسائی سے متغیر ہوئے بغیر آگی کے سفر کو جاری رکھا جائے۔ اس سوچ کے ساتھ انہوں نے شری گاندھی و دھیلیہ اٹھ کا ج، دھنرا میں داخلہ لیا اور 1971 میں یونیورسٹی سے دسویں کے امتحان میں آٹھ کارکامیں میں میں۔

چودھری وجیہ الدین کا طاہر چن ہائی اسکول سے سال بھر پہلے ہی پھر پھر اتے لگا تھا۔ شاعری و راشت میں ملی اور طبیعت کو حق تعالیٰ نے رواں کیا۔ چنانچہ اک دفعاں کافر کو روشن کاچ کا تو پھر شرب دروز آشنا کی ورق پا ہونے میں درجنیں لی۔ انہیں کچھ پہنچیں تھا کہ اس تجھر کے پیچھے کی راز پہشیدہ ہے۔ وہ جو کہ لفظوں کا بادہ اور اڑھ کر عالمیے کا حسد بن چکایا ہے میں کمیں کمی کیتے ہیں کہ میں میں صدی میں ایک ایسا سال خوب یا آیا، چودھری وجیہ الدین جس قصے سے تعلق رکھتے ہیں والدین آموں کے درخنوں پر آئے تو کوئی خوببو سے لبر پہنچیں ملیں ہوں اسی انہیں کیہ کوں کو گل گلنے اور انہیں بدھوں کو اڑھ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ لہروں سے لہریز تالاب میں درستک الہامتے ہرے بھرے کھیت رومان انگیز تو ہوتے ہی ہیں۔ ان مناظر کی دلکشی میں کسی ٹکنی کی چک نے نہیں سورا اور طاہر خوش آواز کی چک نے ان کے کانوں میں مویقی ضرور بھیجی ہو گی اور وہ اسی عالمِ قب و تاب سے نہ رکتے ہوئے چودھری وجیہ الدین سے شپور رسول بن گئے ہوں گے۔ شپور رسول بختی ہی ان کے نام کا ڈنکا الہامی ایام میں بختی ہا لیکن اس کہاوت کے بالکل عرصن کہ گھر کی مرغی دال بر بر ہوتی ہے، وہ اپنے قبے میں بھی قدر و احترام کی نظر و دیکھے جائے گے۔ علم حصل کرنے کا شوق انہیں جنون کی حد تک تھا، لیکن حصول کا راست چودھری وجیہ الدین کے مخصوص مزان کی بدوالت ماضی کا حصہ بن گیا۔ زمانہ حال ان کی شاعری سے تباہ کھا، جو کہ پیش کی آگ بچانے کے لیے ناکافی تھا۔ اس لیے شپور صاحب نے ملک زراعت میں داخل ہوئے کا جانکاہ سفر طہبیں ہوتا۔ اس لیے شپور صاحب نے صرف شاعری کے ذریعے شب و روز کا فیصلہ کیا۔ سکل دوں بیگھڑی زمین، تو کرچا کار جدید رائی آلات کے ساتھ کاشکاری کے لیے ہو جو تھی۔ شپور صاحب نے کرچ میں کھڑی بڑیکروگہری نظر سے دیکھا اور کو آواز دی۔ خود رائی کریں سیٹ پر اچھل کر بیٹھ گئے۔ انہیں میں بھی لکائی اور سیدھی دشا

گاںوں کا قابل قبول اہمار اور تناسب پیشانی چار چاند کا دلتی ہے۔ ان کے بالوں کو دیکھ کر رنگ میں بہتلا ہو جانا یقینی ہے کہ میرے سر پر چودھری پکنے کی ہے، لیکن ان کے بالوں میں چاندی کے تاریخ و صدی نے نہیں ملتے۔ پرانی قصادر میں ان کا ہیرا شاہ اخداویں صدی کے شاعروں جیسا تھا۔ لیکن اب اس میں ایک خاص ملیق آگیا ہے۔ لیچھے صاحب اب تو آپ انہیں بچوان ہی لیں گے۔ کیا کہاں، لیکن ان کے چہرے پر انہیں بھی بھچپن بہت کے آثار نہیں میں تو میں شپور صاحب کی ایک اور بچوان بتا دیتا ہوں تا کہ مزید آسانی ہو جائے۔ آپ کو اس اتنا خیال رکھتا ہے کہ اوہ برمیان کیے ہوئے جیلے کے مطابق کوئی شخص نظر آئے اور آپ نہ بذپ میں بہتلا ہو جا میں تو ایسے وقت میں اس کی گستاخ پکان دھریے، اگر وہ اپنی باتوں کے دوڑان گاہے گا ہے چکلے ساتا اور بات بات پر علی گڑھ کا حوالہ دیتا نظر آئے تو یقین کر لیجھ کر بھی شپور رسول ہیں۔ انہیں کا ایک شعر ہے:

خمار لطف نے اور لطف کے سب نے دیا
تر اسم رغب مجھے جی می گنگو نہ دیا

میرے خیال میں ماں کی یوم الدین نے ایک تاریخ مقرر کر کی ہے۔ جس میں وہ ایسے بندوں کو پیدا کرتا ہے، جو اپنے میلان میں بیٹا و لیگانہ اور عالم انسانیت کی فلاہ و بہبود اُن کے شدن کا حصہ ہو۔ یہ تاریخ 17 اکتوبر کی ہے۔ اس تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے دنیا کو ایک ایسے محبد بھی شے دیکھئے جس کے دائرے میں اس کی پڑا روں سال تاریخ آجائے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس سرزین آپ وہل پہنچتیں۔ سرسیدا ہم خال کی مثل ہی کافی ہے کہ آپ ان سے بخوبی واقف ہیں۔ یقین جانیے سرسیدا ہم خال کی ذات مبارک تھیں ہوئی تو آج ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی حالت زاد پر رونے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ میں جھوٹ بولوں تو میری زبان کث جائے، لیکن کہنے والے تو بھی کہتے ہیں کہ میں میں صدی میں ایک ایسا سال بھی آیا جس میں موسم خزاں کا گزری تھیں ہوا۔ اس سال کے شروع ہوتے ہی نے برگ و بار سے درخنوں کی ثہنیاں لگ گئیں۔ کلیاں مکڑاں تھیں تو پھول بن گئے اور پھلوں کے گھوٹوں نے ایسا سرشار کیا کہ درخت چک جگے۔ نظر اٹھائے تو ہر یاں ہی ہر یاں اور خوشی سے چوکڑی بھرتے ہوئے چندورنڈ کا سیال ب دھائی دیتا ہے۔ چڑیاں پھد کتیں اور بہاروں کے گیت سناتے ہیں ٹھیٹیں۔ اس سال بارش تو نہیں ہوئی لیکن ہاول اپنی اوت میں سورج کو چھپاۓ نہ رکنے والی پھوار سے زمین کی خوبصورتی کو مزید دبالا کر رہا تھا۔ نہی نالے اور پہاڑ سب اپنے جوہن پر اڑاتے تھے اور انسانوں کا کہنا ہی کیا کہ مالک خود مختار نے انہیں اشرف اخلاقوں ہیا ہے۔ جب دنیا کی دوسرا ٹھلکوں کا یہ حال تھا تو انسان کی خوشی و مسرت کا ٹھکانہ ہی کیا۔ اسی سال یعنی 1956 کے دو میں میں نے سترہ تاریخ کو ایک پچھڑا اُن کے چودھری خاندان، جس کا سلسلہ اوچھت شاہ صاحب وارثی رحمت اللہ علیہ سے ملتا ہے، پیدا ہوا۔ والدین نے تو نام وجیہ الدین رکھا، لیکن چودھری کا لقج جو پہلے سے موجود تھا ان کے نام کے ساتھ بھی بڑی گیا۔ چودھری صرف نام کے ہی نہیں تھے بلکہ پیشی زمینہ اری اور اوچھت شاہ صاحب رحمت اللہ علیہ کی وراثت، انہیں شرفا میں بلند بala کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس گھر انے کافی سیاست سے گھر ارشاد ان کے اثر و سمع و آفتاب دما جاتا ہے۔

رہا تھا۔ وہ ماتھے کا پسند پوچھتے پارہدی کے ساتھ اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔ اچاک اپک شور بلند ہوا۔ پڑھ چلا کہ ایک شخص کی روپے کے لین دین میں خداوندوی سے جھڑپ ہو گئی ہے۔ اس مuatطے میں شہر صاحب کو دپڑے اس کے بعد یعنی دلوں نے محضوں کیا کہ مدعی تماشائی بن گیا اور گواہ مورچہ سنجال کر دو دو ہاتھ کرنے لگا ہے۔ شور بلند ہوا تو اندر سے اور لوگوں کے ساتھ سینٹر اخراج بھی باہر آگئے۔ ان میں سے ایک شخص نے شہر صاحب کو پھیان لیا۔ وہ سینٹر اخراج کے کافیوں میں کچھ بدالیا۔ دوسرا سے ہی سینٹر اخراج ایکس ساتھ یہ اپنے چیزیں دلخواہ گئے۔ انہوں نے دریافت احوال کے بعد بس اتنا کہا کہ آپ کو لا ایسی میں لگنے کی کاشروت تھی، سیدھے میرے پاس آ جائے۔ پہاں جو چیزیں ہوئی تھیں وہیں کیا جائیں۔ یہ بخراں سے پہلے بھائی میاں نکتہ گئی۔ انہوں نے جو خبری تو شہر صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑکے۔ اسی عالم شاعری و زراعت میں وقت کی پکڑی گھومتی رہی۔ جو پہنچ کی گئی ان سے نافی اور مھائی کی ضد کرتے تھے، علم و فنا کے معاملے میں ایک بچھے چھوڑ کر آگئے نکلتے گئے تو پھر سے حصول علم کی طلب نے زور پکڑنا شروع کر دیا، چنانچہ شہر صاحب نے مکمل چھوڑوں کی طویل مدت کے بعد اسی کامیابی میں، جس نے انہیں ہائی اسکول کا تمندیا تھا انہیمیٹ (پرائیٹ) کا فارم بھر دیا۔ بالآخر 1977 میں ایک اسٹریمیٹ کی سندل گئی۔ اعلیٰ تکمیل کی گئی لاحق ہوئی۔ جی کہ اسی اور اسی شکر کو جانے آموختہ بنا تھا، جہاں سے ایک بار پہلے داہم آچکے تھے۔ ان کے دوچوڑے بھائی گلکیل الدین اور اقبال الدین بھی علی گڑھ سلم یونیورسٹی میں حصہ تربیت اپنی اے اور بی اے سکنڈری کے طالب علم تھے۔ شہر صاحب نے گھروں کی رائے کے خلاف اپنی مریضی سے زراعتی ذرے داری سنبھالی تھی اور قریب پاچ سال تک اس کی وجہ سے تعلیم کا سلسہ مقطوع ہو گیا تھا۔ بعد ازاں ایک بار پھر کسی سے مشورہ کے بغیر اپنی مریضی سے زراعت کی ذرے داری کو ترک کر کے علی گڑھ میں چونکہ اپنی مریضی سے (بقول اہل خانہ) چھ سال شائع کیے ہیں، اس لیے مزید قیمت حاصل کرنے کے لیے گھروں کے کوئی پیشہ نہیں لیا جائے گا۔ میں خود ملازمت کروں گا اور اپنی پڑھائی کا صرف اپنی جب سے ادا کروں گا۔ انہوں نے اپنا عندیہ بھائی میاں پر ظاہر کیا۔ وہ سکون سے سنتے رہے اور اچاک اپنی جگہ کا اٹھار کرتے ہوئے ناظوری کی مہربت کرتے ہوئے فرمایا:

"تمہاری لیاقت ہی کیا ہے..... اضمیدیٹ.... تمہیں تو کوئی چہاری بھی نہیں رکھے گا۔ جتنی خواہ تھیں ملے گی اس سے زیادہ تو ہم گھر کے نوکروں کو دیجے ہیں۔ یہ سب باتیں کرتے ہوئے جیھیں شرمیں آتی؟ جس طرح تمہارے دوچوڑے بھائی ہاں میں رہ کر قیمت حاصل کر رہے ہیں، تم بھی اسی طرح کرو۔ کون منع کرتا ہے، لیکن یہ ذکری کر کے پڑھنے والی شرعاً حقاً ہے۔"

شہر صاحب اپنی دھن کے پکے تھے، جو بھی ایک بار طے کر لیتے تھے وہی کرتے تھے، چنانچہ بھائی میاں کا فرمان سن کر پریشان ہو گئے۔ مایہی دامن کیر ہوئی تو شب وروز ایک جسے لگنے لگے۔ نہ اٹھنے پہنچنے پینے کی طبلہ، بس ایک ہی گلرومان گیر تھی کہ کسی طرح مجسماً طبیعت کی تکمیل ہو جائے۔ اسی زمانے میں اتر پردیشیں اسیلی کامیشن شروع ہو گیا۔ بھائی میاں ایل اے تھے، اس لیے وہ لکھنؤ پلے گئے۔ موقع اچھا تھا۔ شہر صاحب اسی کے سامنے روئے،

میں گھادیاں فضا میں کالے مرغیوں کے ساتھ غرغاہت کی تیز آواز گوئی اور وہ دھول اڑاتے ہوئے آنکھوں سے اچھل ہو گئے۔ بزرگوں نے بالک لگائی، اس پیشے سے انجان بہت ہی نادان چوکرائے۔ دیکھوں لکھیں میں کہیں کوئی غلطی نہ کر پہنچے۔ سنتہ تو کرتال سے تال ملاتے ہوئے گھٹت کی منڈی پر جا پہنچ تو ان کی آنکھیں پہنچ کی پہنچ رہ گئیں۔ شہر صاحب تریکھری توکلی بر جھیوں سے کی تیکھ کھیت کی منڈی پر جا پہنچ تک پہنچ گئی۔ ایک جشن پاہوا اور خشیوں سے تماں یا جو چورہ کلابی ہوا تھا۔ پھر کیا تھا، جن کی آنکھوں کو ریشم کا یارا ہو جائے، ان کے لیے ملکھیں آسان ہو جاتی ہیں۔ شہر صاحب کے ساتھ کھیت میں موجود ہوتے۔ بھی ان میں بھی لکریں پہنچ گاٹتیں، بھی بولائی کی جاتی۔ بھی زمین کی سطح کو برداشت کا جاتا، اصل اگنے سے چار ہونے تک اس کی دیکھ بھال میں وقت گزتا اور کٹائی کے بعد ہوئیں کے مرغوںے چھوڑتے تریکھری غرغاہت کا انوں میں شہنائیاں جانے لگتی۔ ان کا ماموں سے موقع ہمال کر کھیت کے چیزیں کھڑی میں آپیٹھے۔ پہاں انہوں نے اپنی ادنی پیاس کی تکمیل کا سامان فن شاعری، عروض و بلاعث کی کتابوں اور مشہور شعراء کے دوادوں کی صورت میں رکھ چھوڑا تھا۔ دیوان پر بھی تاثر، تجھے سے کہنی لکھائے کی کتاب کی ورق گردانی میں ایسے منہک ہوتے کہ گدوں میں کھیری کی جنمیں اسی ادنی تقریب میں ان کے ایک لٹکوئیے یارے آہستہ سے میرے کان میں کہا کہ شہر رسول کی پیشہ مشہور غزلیں اسی کھڑی کی دین ہیں۔ زراعتی مشاغل میں موسال گزرنے کے لیے ایک دن چدائی ٹھیک کے طبع ہوتے ہی کہ قاف کی ملکہ کا مع لاؤں کھرادھرے گز رہا۔ نظر اٹھائیے تو ہر یاں کی پارلہماں نصیل کی صورت میں پھی ہوئی تھی۔ شہر صاحب کھیت کے چیز کھڑے ہر یاں کوئی آنکھوں کے ہمارے گونوں گونوں کو جانا چاہیے تھا۔ اس ہوش رہا مظہر کو کھڑک خدمت گاروں میں سے ایک نے ملکہ کو تاف سے کہا کہ اس خطے میں ہلہماں ٹھلوں کی تصویر نہ صرف دیکھنے کے لائق ہے بلکہ اس پر دل فریختہ ہوا جاتا ہے۔ کھیت سربراہیاں، زراعت لا جواب۔ ملکہ نے آنکھیں بھر کر دیکھا تو انہیں ہر ہی بھری ہلہماں ہوئی فصلیں اور ان سے کہیں زیادہ کھیت کے چیز کھڑا کس ان پسند آیا۔ ابھی وہ فریقی کے عالم میں پکنچے ہی وابی ہیں کہ بادشاہ کا ہر کارہ آیا اور انہیں اڑا کر کوہ قاف لے گیا۔ شہر صاحب چودھری زیندار تھے، لیکن ان میں چودھریوں والی کوئی بات تھی اور شہی زینداروں کی اکڑوں کا شاپرہی ایں چھوکر کر رہا تھا۔ وہ اپنے بڑوں بزرگوں کو جس نظر سے دیکھتے، وہی نظر جھوٹوں بالخصوص ہر دوڑوں اور کامگاروں پر بھی اُسی انداز میں پڑتی۔ جو کچھ اپنے پہنچ کرتے، وہی چیزیں اپنے ماتحت کام کرنے والوں کو سہیا کرتے۔ ایک دفعہ ان کے والد بزرگوں اور چودھری ریشم الدین وارثی نے (جنہیں شہر صاحب بھائی میاں کہہ کر مخاطب کرتے تھے) ادا سیکی سینٹر سے کچھ کی بھایاں لائے کو کہا اور ساتھ میں سینٹر اخراج کے نام ایک رقہ لکھ کر اس ہمایت کے ساتھ تھیا کہ اس کو دوکھانے پر قم کی وصول بیانی میں آسانی ہو گی۔ شہر صاحب ضروری کاغذات کے ساتھ سینٹر کی گئے۔ وہاں نہ تھم ہونے والی ایک بھی قطار تھی۔ شدید گری سے لوگوں کا اہم احال ہوا جا رہا تھا۔ اس کیفیت میں شہر صاحب کو قدم دکھا کر سینٹر اخراج سے روپیہ لینے میں قطار میں گئے لوگوں کی حق تھی محضوں ہوئی۔ چنانچہ وہ بھی بیکھوں لوگوں کے بیچے جا کھڑے ہوئے۔ وقت گزرتا رہا۔ لوگوں کا اٹھا مخاکہ تھم ہونے کا نام نہیں لے

کانوں تک کا سفر طے کرنے میں کامیاب ہو گئی:

"یہ تہاری تصویر ہے"
"ہاں"
"تم شہر بولو"
"شاید"
"تمہارا نام شہر رسول ہے"
"قلم کی نام"

یہ بات ہوٹل سے لکھی اور پیغام رسیٹ کی پہلی گئی۔ شہر صاحب کے کلاس ٹیچروں میں ایک نام ڈائٹریشورپریا کا بھی تھا، جو اس وقت کپھر رہتے۔ وہ اگلے دن کلاس روم میں آئے تو سرگوشیاں گونج کی تھیں احتیار کرنے لگیں۔ شہر صاحب نے پوچھا:
"کیا بات ہے؟"

"سر..... وجہ صرف وجہ الدین نہیں بلکہ شہر رسول بھی ہیں۔"
ایک عاشق شعر نے مزید سالیا تو شہر صاحب کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے شہر صاحب سے کہا:
"تم نے کمی بتایا نہیں۔"

شہر صاحب نے مخفف سارہ جواب تھا:
"سر..... میں کلاس روم میں ایک طالب علم کی حیثیت سے آیا ہوں۔"
اس کے بعد شہریار صاحب سے ان کی بے تلقی ادب و احترام کے دائرے میں آگے بڑھنے لگی۔ پھر تو ایسا ہوا کہ جس طرف شہر رسول نے رخ کیا ایک بہوم عاشقان ساتھ ہوا۔ اس کاروان میں طالب علم کو فون کے ساتھ ہاہر ہیں شعروادب بھی تھے۔
میرے ذہن کی ختنی پر کچھ نام جو کندہ رہ گئے ہیں، ان میں اختر انصار، اسد بدالوں،
ہلال فربی، مظہم علی خان، قتل الہدی فریبی، ابو صالح، ریس الدین ریسیں، کامران، گنجی
اور مظہر بہائی اور پڑھنے میں ارتبے ہیں۔ ان کی تلقی تو خیر ہر ایک نام کے ساتھ تھی، لیکن اسد بدالوں سے گاہی بھختے گئی۔ دونوں گھرے دوست کیا ہوئے کہ سارے شہر کی نظریں ٹیہی ہوئے لگیں۔ کان بھرنے کا سلسہ شروع ہوا۔ ایک دن تماشا یوں نے دیکھا کہ داش گاؤں و فن میں ایک بیٹی ہائی بن گئی ہے، جس کے ایک سرے پر اسد بدالوں کی صورت تھی اور کیکن کچھ جہاں دیدے اشخاص جن کو یہ دراڑ جو لوں کے درمیان کھنگنا کی وجہ سے پیدا ہوئی گئی تھی، ایک آنکھ نہ بھائی۔
انہوں نے اسے پائے کہ ہر گمن کو شک کی صورت تھی اور کیکن کچھ جہاں دیدے اشخاص جن کو
وقات ہیں، جنہوں نے کچھ محترم دوستوں کی زور تھی کے غبارے کو بخالا نا شروع کیا۔ غبارہ تو چھوڑا گیا، ایک داحدہ لشڑی کا صمد شکر کہ پھٹا ہیں۔

شہر رسول کے بزرگ دوستوں میں اختر انصاری کا نام سر فہرست ہے۔ علی گزہ کے جو اے سے دونوں کولازم و طروم قرار دیا ہے، بہتر ہوگا۔ لکھتے جامعہ کی علی گزہ شان، شاعر زریں کے سمشیعی شعروادب کی آجائی گاہ بن جاتی تھی۔
قریستے سے رکھے دیبا بھر کے رسائل و جرائد کی درق گردانی ہوتی۔ اضافہ نشریہ پر بھیں طوں پڑتیں، ادب کی نئی سمت و رفتار پر باتیں کی جاتیں۔ شعروادب کی شخصیات، طرز لگاڑش اور ان کی گزارشات کے معاملے و معاشر پر گنگوہتی۔ ہی ایسا ہوتا کہ اجتماع ناہری کے کوئی شخص چلا جاتا تو اس کی شخصیت پر اس طرح کے تبرے

گزگزائے، فریادیں کیں اور طرح طرح کے دلائل پیش کیے۔ ممتاز کرتی بھی کیا۔

بیٹے کے سہرے مستقل کی چاہت میں جھک گئی۔ شہر صاحب نے ضروریات کی جیسیں ایک باکس میں رکھیں اور نکل پڑے۔ وہ تارکوں کی بیکی سڑکوں سے گزرتے ہوئے مسلم پر یونیورسٹی کے کیپس میں داخل ہوئے۔ کاغذی کارواں ایکوں کے ساتھ ان کا داخلہ کئی شفت میں ہو گیا۔ یہ جدوجہد تھی، جس نے آئر کارا کامیابی کا مژدہ سنایا اور انہیں بھی افسرداری و محرومی کے بعد زندگی کی زنجیر کا سرا آخکار ہاتھ آئی گیا۔

علی گزہ، ہندوستان کا ایک اہم شہر، جو سریدیہ احمد خاں کی تھی، ادبی اور سائی تحریک کا مرکز و محور ہاں اور جس نے کافی ترقی پر یونیورسٹی بن کر گھنیں جیاتیں میں ایک مخصوص پیچان بیانی۔ شہر صاحب نے اسی شہر کا پانچ کا جتو بیانی اور یہیں کے بعد ایم ایم ہاں کے خیال میں منت ہو گئے۔ حب نشا تمام مراحل طے ہوتے چلے گئے، لیکن مسئلہ خود فکری ابھی باقی تھا۔ سیل بیل یوں لکھ کر یونیورسٹی کے ایک آفس میں عارضی توکری میں، دن دن بھر فاکٹریوں کے پیچے سر کھانا طبی نازک پر گراں گزرا تو کرمی پر اڑائے۔ انہی دنوں یونیورسٹی کے میڈی بلکی کافی میں آسائی (Vacancy) آئی، حاجت خود مختار نے استقلائی صورت ہاتے ہوئے کہا:

"اے صاحب! غریب الطین مسافر ہوں، یا وادا جداد کی زرافشانی پیچھے چھوڑا یا۔ مزکر دیکھا دل نا زک کو واس نہیں آتا اور اس کی چاہت کرنا شان بے نیازی کے لئے ہے۔
ہے۔ کئی دن ہو گئے کہ گھونٹ گھونٹ جیسے پر بچھوڑو ہوا ہوں، اب یہ حال ہے کہ کلیچ نہ کو آتا ہے۔"

اس کی باتوں کے اسرار میں سے شہر صاحب ہوئے کہ آننا غرض دیہی۔ زندگی کی میری میری سیدھی ہو گئی اور وہ بیکثیت رپیشہت میڈی بلکی کافی میں آنے جانے والوں کی رہنمائی کرتے ہوئے نظر آئے۔ وہ فرضی شخصی نہ مانتے ہوئے روزانہ بے صبری کے ساتھ سورج کے نیزے کو ٹیکھا ہوئے کا انتظار کرتے۔ جب آگ اگلاتا ہوا سورج اتفاق کے اس پار چلا جاتا تو دیے پاؤں باہر نکلتے اور کچھ وقت کے بعد کلاس روم کی راہ لیتے۔ وہ گلستان شعر و ادب کے شہر رسول تھے، لیکن مرپا اذکار و افکار ہوتے ہی دبائکلا چودھری وجہ الدین تدرست و قوانا ہو کر نہیں آدم کی زبان پر چڑھ گیا۔ انہی دنوں "شاعر" کے ایک شمارے میں شہریار کے ساتھ شہر صاحب کی ایک غزل شائع ہوئی۔ خیال آرائیاں ہوئیں کہ رسائل میں چھپی شہر رسول کی تصویر چودھری وجہ الدین سے مشاہدہ تھی، لیکن یقین کا پرندہ، بہت دنوں تک ہاتھ آیا۔ ہم جماعتوں میں سے ایک شخص چودھری وجہ الدین سے ہائی ہوئے ہندو پاک کے موقر رسائل کے اوراق کو الالت پلٹتا جاتا۔ اچاک کہ اس کی نگاہیں ساکت ہوئیں اور کانوں میں انشا بھی نکلتا نے گے۔ "عُسْ تَصْرِيْحُ هُنَّ سَمَّى كَمَادِتْ خَاصِيْ" مہوت گن کی سائونوں سے گزرنے کے بعد آنکھیں، ہمی وجہ الدین پر جا ٹھہر تیں اور کہی رسائل میں چھپی تصویریے بائکتیں۔ جنک و شہر کی گنجائشیں تھیں تھی کہ رسائل میں چھپی تصویری وجہ الدین تھی کی ہے، لیکن سر تصویر جو نام چھپا ہوا تھا، اس کی ہم آنکھی تصویر سے پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ تدبیب کا ایک سیلا بخاک تھا کہ ٹھاٹھیں مارتبا وادیں ہن سے گزرا ہاتھ۔ آخر کار اس سے نہ رہا گیا۔ زبان میں کھیچا کے ساتھ بول کو جتنی ہوئی اور ایک آوار نضا کے سینے کو چیڑتی ہوئی وہاں پر پیٹھے وجہ الدین کے ساتھ دوسرے لوگوں کے

شائع ہو پکا تھا۔ ان کا ایک شعر خاص انتقال ہوا تھا، جسے اخْرِ انصاری پڑھتے اور انہا سر دھنے تھے۔ عمر تو کاث دی سائے میں سیئے بُخت کے اب جانی کی طرف اک قدم اور جسی وہ نزیں کرہ مجوہے کو اپنا آخِری سرمایہ کھجھتے، چنانچہ اس منابت سے شہر صاحب نے مجھے کا نام "ایک قدم اور سی" تجویز کیا۔ جسے کرخی سے اخْرِ انصاری کا چھرہ تھا اخْرِ انصاری وہ اپنی گلہ اچھل گئے۔ ان دو ڈھر کوں کے درمیان زندگی کی خوگلوارشا مول کالا مٹاہی سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

شہر صاحب نے مسلم یونیورسٹی میں تعلیمی، معاذی اور معاشرتی زندگی کرتے ہوئے 1981 میں پہلے آٹ فرست آئی کی ڈگری فرست ڈیپیون میں ہی حاصل کی اور اسی بُخت گلری کو جلا دیتے ہوئے 1984 میں فرست ڈیپیون میں ہی ماسٹر آف آرٹ ہونے کا ہم اپنے سر بن چلایا۔ اس طویل عرصے میں ضا الہین ہوشی کے چھوٹے سے کرے میں شہر صاحب کے چانپے والوں کا مجھ لگا رہتا، جس میں یونیورسٹی کے دستوں کے علاوہ شہر سے آئے ہوئے ان کے پرستار بھی ہوتے۔ گاہے گاہے دو روز کے مہماں کی ہفتہنی خاطرداری کی جاتی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ یونیورسٹی اور گھری سیاہ کھانی کے اس پار منعقدہ نشتوں میں بھی بلا ٹکاف شریک ہوتے۔ ان کے کرے میں بہت سے لوگ آتے اور وہ خلوں میں ایسے بندھنے کی بیش کا ساتھ ہو جاتا۔ ان کا سابقہ بہانت بہانت لوگوں سے پڑتا تھا۔ ایک واقعہ طرح ہوا کہ شہر صاحب کے روبرو مکین صورت ہنا کہ ایک نوجوان آٹھرا ہوا۔ اس نے اپنی ٹھلی کا تذکرہ پانڈ بانگ اندزا میں اس طور کیا کہ ان کا دل پکل گیا۔ باغتہ کی جو ٹھنڈی، آج بھی جاگ آئتی۔ انہوں نے اپنی جیب ٹھوٹی اور پچاس روپیہ کا کڑکڑا تھا ہوا نوٹ ٹھاک کر آگے بڑھا دیا۔ نوجوان چلا گیا تو وہ سورج میں پڑ گئے کہ ان کے پاس میں آخری نوٹ پچا تھا۔ ابھی ٹکرات کے سمندر میں غوط زن ہی تھے کہ ایک کی آواز آئی:

"شہر رسول صاحب ہیں"

"جی ہاں، بیں"

اس نے اپنے بیک سے متین آڈر فارم کالا اور دستخط کرنے کے بعد پچاس کا دیساںی نوٹ جیسا شہر صاحب نے مکین صورت نوجوان کو دے دیا تھا، ہاتھ پر رکھتا ہوا در چلا گیا۔ وہ بہت دریک اپنی جگہ تھیک کر کرے۔

بعد ازاں شہر صاحب کی زندگی میں دوسرے ساتھ تین دفعے ایسے رونما ہوئے، جن کی تباہیوں کی شاعروں نے شیاعت کے مئے جو ہر دھکائے اور وہ زندگی کی نی شاہ را ہوں پر بنا خوف و خطر پار مردی کے ساتھ رواں دواں ہو گئے۔ پہلا واقعہ تیر ہوا کہ یونیورسٹی میں ان کی حیثیت طالب علم کی نہیں رہی اور انہوں نے گھری اندھیری کھانی کے دوسرا طرف کرائے کہ ایک گرے میں خود کو قید کر لیا، لیکن کھانی کے دو فوٹ کارروں کے لوگ پچھا چھوڑنے والے کہاں تھے۔ روز شام کو چھوٹے سے کرے میں بہت سے سروں کا اجتماع ہوتا اور ادنیٰ دھماچکڑی شاپ پر آ کر ایسے چھلتی کہ آس پڑوں کے لوگ ٹک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دو رواقہ یہ ہوا کہ ماسٹر آف فلاٹی میں داشٹے کے لیے انہوں نے جواہر لال نہر یونیورسٹی میں فارم بھرا۔ تیری امتحان میں پہلا مقام حاصل کرنے والوں کو یونیورسٹی وظیفہ دیتی تھی۔ رزلت آیا تو شہر رسول کا نام بالائی پر سہرے حروف میں چکر ہاتھ۔ وہ پرتو نے والے ہی تھے کہ ایک دیرینہ یار ناظموں کا کچھلٹا شیشہ غصہ ماعت میں ایسا اٹھیا

کے جاتے کہ مددوں کے عزیز و اقر پا جو عالمِ ارواح میں پناہ گزیں ہیں، سن لیتے تو میر خاکی دھارن کر کے دودو ہاتھ کرنے پڑا تھا۔ اس لیے خطل برخاست ہوئے تھے کوئی بھی فرد اپنی چکر سے نہ سے میں نہیں ہوا اور کہتہ جامعہ کی مریٰ وغیرہ مریٰ اشیاں کے انداز گھنٹو پر عش عش کرنی ہوئی نظر آتی۔ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے پیشتر ادیب آتے، ایک دن رنگ بر لگے کپڑوں میں بلوں، سر پر انگریزی ہیئت لگائے، اپنے مخصوص انداز سے سگار کے کش لگاتا ہوا ایک فنکس داٹھ ہوا۔ اخْرِ انصاری کا یہ عالم کے تمام حاضرین اپنی گلہ پر کھڑے ہو گئے۔ ابھی کافی صاف ہوئی توبہ دہاہٹ سنائی دی:

"یہ اخْرِ انصاری ہیں"

اخْرِ انصاری نے طائرہ نظر مجھ پر ڈالی اور ایک کرسی پر شاہزادہ انداز میں بیٹھ گئے۔ ان کی گھنٹو کی تھی علم و آگی کا دریا تھا جیسیں مارتا ہوا محض مکالمہ پیر کہ "ہوں، ہاں" کی آواز کے علاوہ کچھ اور سائیں دستا۔ وہ اپنی گھنٹو سے سیراب کھلتو کسی نے ان کی چھڑی اٹھا کر دی اور وہ صافگر تھے ہوئے دو روز قدم مزدیں جی جانب بڑھے۔ شہر صاحب بھیز کو چیرتے ہوئے آگے آئے، دونوں کے ہاتھ لے اور ظریں چھرے پر لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھنے لگیں۔ اخْرِ انصاری جہاں دیپہ تو تھے، ہی نو اپنے شہر صاحب کے چڑھتا بابا کو پڑھایا اور رازدار اپا تھیں کرتے ہوئے ساتھ ساتھ ہو لیے۔ ایک چکر کے، شہر صاحب نے کاغذ پر کچھ لکھریں کچھی اور پچھے اخْرِ انصاری کی طرف بڑھا دیا۔ تمثیلیوں کی نہیں تھاں تھاں کوچھ نہیں۔ سیکڑیں تدبیریں اور ہزاروں جن کے بعد بس اتنا پچھہ چلا کہ اخْرِ انصاری کے نور نظر جو کمی بخٹ جگرنہ بن سکے ہیں ملازم ہو گئے ہیں۔ اس دن سے شہر صاحب کا لیکین اس مصرے "ہوئی ہے شامِ لطفِ ملقات کے لیے" پر ایسا پچھہ ہوا کہ مغلی مظاہرے کا اٹھ حصہ بن گیا۔ ان کی شامیں جو رات کے گھے ختم ہوتیں اخْرِ انصاری کے ڈرانگ روم میں گزرنے لگتیں۔ شعر و ادب کے ان دیوانوں کی گھنٹو کا مرکز جو درسائکل میں چھپی کر لیتھ رہتی، مختلف زبانوں کا ادب زیر بحث آتا اور ماضی و حال کو آئینہ کیا جاتا۔ کیسی کیسی قاتمیں ان کی گھنٹو کی حصہ بن کر استعمال کو پہنچتیں۔ اسی لذت میں بھی کعبہ جنگی گھنٹو بھی فلی آتی۔ ایک روز اخْرِ انصاری فرمائے گئے کہ شہر صاحب میں اپنے آخری مجھوں کام کا نام "پس دہانِ رزم" رکھنا چاہتا ہوں۔ اس سے کافی دونوں پہلے اُن کی کلیات "دہانِ رزم" کے عنوان سے شائع ہو چکی اور وہ شاعری سے توہ کر چکے تھے، اس لیے کہا دیا گیں بلکہ حقیقاً "دہانِ رزم" ان کی شعری کائنات کی آخری ایشتگی۔ شہر صاحب کی آمد و رفت کیا ہوئی سوکھے سوتے چھوٹ لکھ۔ بقول اخْرِ انصاری یہ سرمایہ شعری انہیں صحبتیں کا گلکی و تحقیقی تھے، جس کا نام وہ "پس دہانِ رزم" رکھنا جاتے تھے۔

شہر صاحب نے ان کی باتیں سین اور لوقت کیا۔ لمحہ جان گدا رائیں بے چین کرنے لگا، ان کی مجتسما نہیں بار پار اُنھیں اور اپنے اطراف کا چائزہ لیتے لگتیں۔ شہر صاحب جو بظاہر مراتبی میں تھے، اپنی گردن سیدھی کی اور اخْرِ انصاری سے نگاہیں ملاتے ہوئے پئے شلے لجھ میں کہا کہ یہ نام ساعت پر کوئی خوگلوار تھا نہیں چھوڑتا۔ اس میں "پس" ہے اور "رزم" بھی ہے۔ اخْرِ انصاری چونکے اور کہتے گے کہ ارے اس طرف تو مرا ذہن ہی نہیں گیا، اب آپ ہی نام جو بیڑ کریں۔ اخْرِ انصاری پر مکین احسن کلیم کا مضمون "اردو کا اخْرِ انصاری" رسالہ "آن کل" میں

میں شفراحمد ناظمی کا نام سرفہرست سے کہ انہوں نے آئینہ ک اساتھ کانٹ میں تابروڑ اتی ششیں کرائیں کہ مجھے چیز کم تھیں تو مجھے کا سلیقہ آگی۔ شفہر صاحب کا قیام ذاکر گر میں ہونے کے باعث شامیں انکار میں کے دفتر میں کر رہیں۔ اسی دفتر میں عطا عبدالی بطور اسٹنٹ مدیر بحال تھے۔ شفہر صاحب کے نام سایوں میں کوڑ مظہری کا نام خاص تھا، جوان دفعوں شعبہ اردو جامعیۃ اسلامیہ میں ریسرچ اکالر تھے۔ وہ ہم سایپر تھے ہی سایپر بن کر ساتھ بھی رہتے تھے۔ خوب یاد یا کہ 1996 میں کوڑ مظہری ایک اسکول میں استاد بکر بورہ ہائی اسکول، درجہ گر (بہار) پہنچ گئے۔ اس اسکول میں تقریباً چھ میئن گزارنے کے باوجود ہاتھ ملتے رہے کہ اس طویل عمر سے میں منوری (Approval) نہ ملے کے سبب ایک ماں کی بھی تجوہ نہ تھی۔ اسی تھی دو اندر ہناک ساتھ ان کے بیٹوں فححان اور القاب کی صورت میں ایسے رہنا ہوئے کہ قوت مرد کے سلب ہو گئی۔ وہ اسی عالم جوں میں جیان اور بیان لوگوں کے پھر کوں کو دیکھئے رہے تھے کہ اسیں لکھنے و مطہری مضمون کا مفہوم بسک اتنا تھا کہ واپس دہلی آپا کا اور جیخیا کیک کو نے میں دیکھنے کی شہر میں شفہر صاحب لکھا ہوا تھا۔ خط پڑھنے کے بعد کوڑ مظہری نے تین پکڑی اور وہ دہلی آپنچھ۔ ان کی واپسی کا ٹکون اچھا تھا۔ اسکے اکتوبر 1997 میں Adhoc Lecturer کی جمیعت سے شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پرے وابستہ ہو گئے اور ایک سال بعد یعنی 10 اگست 1998 میں وہ اسی شبیہ میں مستقل استاد ہو گئے۔

شفہر صاحب کے لکھ رہے کے سال بھر بعد یعنی شفہر صاحب کی بھی دہلی آگئی۔ جائے سکونت غفار میں دو کمروں کا ایک قبیٹ بھرا کہ سات آٹھ بڑا کی قیبل تجوہ میں اس سے بہتر چک کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس پر بچوں کی پورش و پرداخت اور ان کی تعلیم ممتاز تھی۔ بچوں کا داخلہ کی اچھی اسکول میں ہوتا زیادہ ضروری تھا۔ بھاگا دوڑی شروع ہوئی، میں دوں بدلوں ہر مرے کے میں ان کے ساتھ ہوتا۔ انیں اسکولوں کی ناک چھانے کے بعد آخر کار دہلی پکک اسکول میں ایڈیشن ہو گیا۔ اس کے بعد زندگی کو آسان بنانے کی اور بھی کئی مہنات سرکی گئیں، بالآخرہ داری حیات سیدھی چال چلے گئی۔ یا گھر بیگم شفہر صاحب کے لیے ایک ڈرے جیسا تھا کہ ان کی آبائی کوئی بندہ شہر میں جو ہزارگز کے لیے چوڑے علاقے پر مشتمل تھی۔ آنکھیں چھلک چھلک آتیں تھیں، لیکن، بچوں کے آگئن پر تقدیر ہوتا ہی۔ بھی گھر دو خشے منے بچوں کے علاوہ مہمان نوازی اور اقتداری کے بھیلیوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا رہا۔ بیگم شفہر صاحب یعنی رضوانہ بھائی ملکی میکے کی طرف دار، اس محققے کے برکس کر خوشنام اپنی تصدیق صلاحیتیں سرال کے لیے محفوظ رکھتی ہیں، اس سے زیادہ شوہر کے نسبت کا خیال رکھتی ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو، وہ سرال نہیں بلکہ ان کی غالہ اماں کا ہر ہے۔ بھائی بھی اپنے اسلوب اور سکون اخلاق سے لوگوں کو ایسا گویدہ کیا کہ شفہر صاحب کے دوستوں اور شاگردوں کی زبان پران کے نام کا ورد ہونے لگا۔ مشاہدہ گواہ ہے کہ ازدواجی زندگی کے ساتھ انہوں نہیں کے دوسرا میدانوں کو بھی خوش اسلوبی کے ساتھ فوجی کیا ہے۔ مجھے ان کی قیمتی میں تائید الگ نظر آتی ہے:

کیوں نہ حصے میں ترے فتح کا میدان رہے
کہ مدد کرنی ہے تائید الگ تیری
انپی تمام مسائی کے علی الرغم روشنی ازدواج آسمانی کے ساتھ سمجھ جاتا تو پھر جنت کے

کوہ شش رو ساکت رہ گئے۔ ہوایہ کے جریئی امتحان کے فیروز مندوں کی چلیا سڑ کی جگہ ایک اور لست آئی، جس میں شفہر صاحب کا نام کھک کر دوسرا مقام پر آگیا تھا۔ بہت دنوں کے بعد پیدا چلا کر پروفیسر محمد حسن جو اس وقت سٹراف انہیں لگو ہجر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے چیز پر تھے، داخلے کی متکل جانے کے بعد تک

انتظار کرتے رہے، کوئی صورت ظہریں آئی تو ان کے بعد والے نام کو سُن سمجھا گیا۔ اس ولقے کے سال بھر بعد انہیں شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر عنوان چھتی کے زیر گمراہی پی اچ ڈی میں داخلیں یا بعدازال یہاں کو جو شخص خود نہیں کے بیکر تراشنا تھا، اس نے اردو غزل میں بیکروں کی طلاق کا جانشہار بنا لیا۔ تیرسا اور نہیا بت ہی خوگلگوار واقعہ 1986 میں پیش آیا کہ شفہر صاحب کے ساتھ ملکہ پر کا اضافہ ہو گیا یعنی دو رہنما ازدواج سے منسلک ہو گئے۔ ایک ہجوم بے کرال تھا کہ "بازک اللہ لک" وہاڑک علیک وحیم پینٹھانی خیز" کا ورد کرتا ہوا مبارکبادیاں پیش کر رہا تھا۔

شفہر صاحب مستقبل کو حمال اور حلال کو ماضی بناتے ہوئے زندگی کرنے لگے۔ ہجوم دوستاں، کتابی پارال اور معیشت دوسریں کا ساتھ سنبھارے دنوں کو مزید خوگلگوار بناتے ہوئے تھے، لیکن ابتدا سلسہ اس طرح جاری رہا کہ پی اچ ڈی کے تعلق سے دہلی آتے اور خالی ہاتھ واپس لوٹ جاتے۔ چنانچہ اس دوران پروفیسر عنوان چھتی سے بھاگی کی صورت بھی پہرا ہوئی۔ اسی صورت نے پی اچ ڈی کے پانچ سال کو کچھنا شروع کیا اور وہ برک طرح پتھتے چھتے کی سالوں پر پھیط ہو گئے۔ حضرت

اوگٹ شاہ وارثی صاحب کے گرس کے موقع پر واپسیان و معتقدیں کے ساتھ پروفیسر عنوان چھتی بھی شامل ہوتے۔ ان کا تعلق شفہر صاحب کے برادر بزرگ چودھری رضی الدین (احمر رضی) صاحب سے تھا۔ اسال جو سالانہ فاتحہ میں شرکت ہوئی تو انہوں نے اپنے دل کے پھیپھی لے ایک ایک کر پھوڑ لیے۔ شفہر صاحب کی جو خبری گئی تو انہوں نے ڈاکٹر اف فلاسفی کی ڈکری حاصل کرنے کے بعد ہی مل میا۔ ڈاکٹری کی ڈکری سے پہلے انہوں نے شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں گیٹ پھر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دیں، لیکن اس کا جو پھل ملا وہ طے شدہ رقم سے بہت ہی کم تھا۔ روز و شب، بہت ہی جاناکا تھے کہ وہ ہجڑی کی صبح دل آتے اور معنے کی شام کو واپس ٹلی گڑھ چلے جاتے۔ ائمہ 1993 میں ڈاکٹری کی ڈکری کی تو اس وقت ہی شفہر صاحب گیٹ پھر کے طور پر شعبہ اردو کا حсад تھے۔ ڈکری ملتے ہی شعبے میں آسائی بھی آگئی اور دوسرا میڈیا والوں کے ساتھ انہوں نے بھی فارم بھر دیا۔ زبانی امتحان ہوا اور فتح یعنی کا جھنڈا شفہر صاحب کے ہاتھوں میں لہرائی گا۔ یہ وہی نظر دار لکیرتی، جس کے اس پارکی تکمیل حقیقت فسانہ ہوئی اور اس پارک مہر ماہ کی تھیں کا لاتھی سلسہ دہزاد ہوا۔ اس کے بعد شفہر صاحب نے کئی چیزوں میں دیکھا۔

شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دن گھر کی سرگرمیوں کے بعد سیاہی چینیے سے پہلے ہی شفہر صاحب شعبے سے نکلا، ان کے قدم بھی ملکتہ جامعکی طرف اٹھتے تو کبھی انکار میں کے دشتر کی طرف۔ ملکتہ جامعہ میں شاہرا علی خان الگیوں کے درمیان سگریت دبائے اور ہونٹوں سے چائے کا پٹ نہیں بلکہ گلاں لگائے اپنے مخصوص انداز میں ان کا استقبال کرتے۔ یہاں بھی دنیا ہجان کی ہاتھ ہوتی۔ اس درمیان حجاج سید اور ہجی پروفیسر خالد محمود آجائے تو گھنٹوں کا سلسہ اور بھی طویل ہو جاتا۔ یہی انتہائی بزرگان تھا، جس کے سامنے تئیں ملکی آگئی کے نٹے سے پوچھے کی آپری ہوئی۔ انہیں کے ساتھ میں نے جامعہ میں گھوم کر کئی نشیں پڑھیں۔ ان

پیالی آتی، وہ عامر سے دم کے مقابلے میں دم چاٹے ہوتی۔ شہپر صاحب کم گروائج ہوئے ہیں، لیکن جی بھی ایسا لگتا ہے کہ شہپر صاحب سنے میں یقین نہیں رکھتے بلکہ پاتنسی نے پر قوت غایبی و باطنی صرف کر دیتے ہیں۔ سناتے سناتے تو نہیں تھکتے البتہ کسی سنے سے واسطہ پڑتا تو قبیل سے مل کر دل بہلانا تو ان کو آتا نہیں کہان کا کوئی رقبہ نہیں، البتہ بجا ہیوں کے ساتھ اگر ایوں کا طوبار بندھ جانا تھیں سمجھ لیجھ۔ جس کا ایک مقدمہ اور بھی تھا، جو میری سمجھ میں دریے سے آیا۔ شہپر صاحب فطرہ ظاہری نماش سے پاک کوئے بھائے سادگی پسندانسان ہیں:

اے حسن سادگی میں بھی ہے تیری پاکن

یہ صحیح اور یہ شام ہماری نظر میں ہے
یہاں کی علیت دوائی کا شہر اور سادگی کا نتیجہ ہے کہ وہ جنک جنک جاتے ہیں۔ اپنی اکتھاٹ کا اظہار چہرے کے اتار چڑھا کر اور لفظوں کی لٹک میں نہیں کرتے بلکہ بجا ہیوں اور اگر ایوں کے ذریعے ایسا نثار چھوڑتے ہیں کہ سامنے والوں کو اٹھ جانے کے طواہ کوئی اور چار نہیں ہوتا۔ میں سارے محاملات سے واقف ہونے کے باوجود ڈھیٹ ہیٹ بارہتا کہ میرا وہاں جانا صرف چاٹے پینے تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اپنی تخلیقات کی اصلاح بھی پیش نظر ہوئی، چنانچہ میں موقع کا فائدہ اٹھانے میں دریں ہیں کرتا اور اپنی ادھ کچھ کچھ چیزیں سامنے رکھ دیتا۔ یہ سلسلہ آج تک جحسن و خوبی جاری ہے۔

شہپر صاحب ایک معلم کے طور پر شاکٹین شعرواب کی تسلیکن کرتے ہوئے، تھیک چھ سال بعد نئی 2000 میں ریڈ اور اس کے آٹھ سال بعد پروفیشنل ہو گئے۔ شب و روز کے ساتھ ان کے دستوں کا دائرہ بھی پھیلا پلا گیا، لیکن یہ اگلے بات ہے کہ پرانے دستوں میں سے کئی چہرے معدوم بلکہ معدوم تر ہو گئے، ان کی جگہ نئی نئی صورتوں نے لے لی۔ "شہپر" پندرے کے سب سے بڑے پر کوئی نہیں۔ جس کی مدد سے پراویز جاتی ہے اور اگر شہپر سول یعنی پیغام رسانی بھی کرتا ہو تو کیا کہنے یوں بھی "آتے ہیں غائب سے مضمائن خیال میں" شاعری اور نثر نگاری دونوں کے ذریعے وہ یہ کام انجام دیتے ہیں۔ ملک اور برونوں ملک میں مشاعر، سینیماوں، کانٹرسوں اور کشاپوں میں آمد و رفت کا سلسلہ پہلے سے بھی قائم تھا لیکن ادھر تو ملک اور برونوں ملک میں نہ صرف جامعہ ملیہ اسلامیہ بلکہ ہندوستان کی نمائیدگی کا سلسلہ مزید دراز ہو گیا۔ ایک بار شہپر صاحب ایک وفد (Delegation) کے ساتھ سعودی عرب کے سفر پر روانہ ہوئے۔ جس میں ملک کے نمائندہ شہزادیر تھے۔ یہ رحمت خداوندی کا غیر معمولی انعام و اکرام تھا کہ جہلی پارخانہ کے عکلی آنکھوں سے دیکھنا نصیب ہوا اور احرام پا نہ کر کھانہ کعبہ کا طواف اور سعی ما بین صفا و مروہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ واپسی پارن کی کلائی پار ایک نیشن کی گھڑی بیکھری تھی، جوان کو ٹھنک کے طور پر ٹھنکی۔ میرا من لیا گیا اور میں گھڑی کی شان میں قصیدے پڑھنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ قصیدہ خونی رنگ لائے گی، لیکن میری مایوسی اپنی کوئی تھنکی کی او شہپر صاحب سب کچھ جانتے بوحثتے ہوئے لش سے میں نہیں ہوئے۔ وہ گھڑی ڈھینت لئی کہ آج بھی ان کی کلائی پر بندگی میرا منہ چڑھاتی رہتی ہے۔ میں مرزا فتح اللہ بیگ ہوتا تو کسی بہانے سے ڈپنی نذیر احمد کی شیر و ان کی طرح اس گھڑی کو زالیما اور پھرگی داہمی نہیں کرتا۔ آخوندگی کا ازالہ یوں ہوا کہ میں برونوں مالک کے مکانہ سفر سے قتل تھے کی فرمائیں کرنے لگا، جسے

تصور میں عالمِ رواح کی سیر کرنے کا جو حکم ہی نہیں اٹھانا پڑتا۔ رکھڑک کے باوجود شہپر سول سیدھے سادے شوہر اور بھابی تھی وہی ہندوستانی بیوی ہیں۔ بعد احتباط انتراج کے جو ہندوستانی مراج کا حاصل ہے، ان کے درمیان ہتھ گولے تو نہیں چلے، لیکن لفظوں کے بہم (جو ہر گھر کا خاصہ ہوتا ہے) ضرور چلتے ہیں، چنانچہ شہپر صاحب اپنے سکون کی دھیجن کوفھا میں قوس و قفر بنتے ہوئے طمانیت کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں۔ اس وقت ہوتلوں پہنی کے پھواڑے تو نہیں ہوتے بلکہ تمہرم کی زریں اہمیات پر نازار اپنا ہی شعر لگاتا نہ لگتے ہیں:

بہت سادہ ہیں شہپر بھی کچھ بھی نہیں کہتے
گر ہر بات میں ان کی بھی من مانی سی ر حق ہے
اس سلسلے میں ایک مثال یہ بھی دیکھ لیجھ کر کی بارہمیرے گھر کا شیرازہ کھرنے کا تو
شہپر صاحب کی معاملہ بھی اپنی مصوصیتوں کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔ ان کی معنی خیرتیم کی زریں بہرہوں نے ٹکول کو احکام جھشا اور گھر کا شیرازہ کھرنے آخوندگی ہی گیا۔ ایک واقعہ ہے، میں کلبلانے لگا ہے، ہوا یہ کہیرے ایک محسن خوسا نخنے کو عیاری کیا سو جھی کر میرے خلاف شہپر صاحب کے کان بھر دیے۔ ان کی جگہ کوئی اور ہیئت اور تعلقات بگزرتے ہیں نہیں بلکہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتے، لیکن شہپر صاحب کی قوت احساس چیز ہی نہیں بلکہ چیز تراویح ہوئی ہے کہ وہ ہوش و حواس صیر و گل کے معاملے میں بہت خوش نصیب ہیں اور ان کی چیزی اور اسکا فورا ہی معاملے کی تھہ کو کھکھل کر اصل واقعہ کو ہن نہیں کرنے میں طاقت ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کے پیشگوئی زبان پر آیا وہ تو فقط دکھانے کی بات تھی۔ اس کے بعد جب سامنا ہوا تو خوشی شب و روز کے تخلیق کیا کہوں کر تھیم انکیز نہ ٹکو اور ہمیشہ نہ دیے کی ہوئی جھنگی عطا تھی۔ ذرا غور سے دیکھا تو ماتھے پر ابھری لکیریں تھیں تویں ہیں۔ میں کانپ کیا، یا اللہ یہ کیا ہوا کہ اس میری دنیا بھج سے روٹی جاتی ہے۔ میں مضمونی کے ساتھ اپنے دل کو تھامے پہنچا رہا کہ یہ بات محبت کرنے والے کے شایان شان نہیں کہ وہ صوبوں سے گھبرا کر تارک دنیا ہو جائے۔ واقعہ کے بعد زبان نے چبٹی کی اور لفظوں کے باریک بان میرے دل ناگفتہ کو چھیدتے چلے گئے۔ جب جا کر معلوم ہوا کہ انسان کی سمجھداری اس کی اتنا کے آگے بیچ ہے۔ قوت اور اسکے پیشگوئی کو حقیقت کو آخوندگی کر دیتی ہے، بلکہ دکھانی نہ دینے والی گردہ پھر بھی دلوں میں پڑھی جاتی ہے۔ استفسار کرنے پر میں نہ چھائی من و عن یوں کر دی۔ اس واقعے کے بعد نہ تو کسی نے ان کے کان بھرنے کی بہت جانی اور نہ ہی مجھے درغلانے میں کامیاب ہوا۔ بڑا ست خود مجھے اس واقعے سے بہت فائدہ ہوا کہ میں اپنی صورتوں میں مختلف شخص سے رود رہ جاتا ہوں اور وہی خبار آکے جھکتے ہی جو ہوا ہو جاتا ہے۔ میرے حافظے کا قصور ہے کہ میں لا شعوری طور پر بکھ جانا ہوں اور بھکھتے دوڑکل آنایمیری فطرت کا امتیازی پہلو ہے۔ ہاں تو بات بھائی تھی کی ہوئی تھی۔ ان کے دلی آنے کے بعد میں موقع کی ہلاش میں رہتا اور کوئی نہ کوئی دادا چلتا ہوا کامل میں کے سونک پر انکی رکھتی دیتا۔ دروازہ کھلتے ہی شہپر صاحب آسمیوں کو چڑھاتے ڈرائیک روم میں آبیٹھے، میں کی صوفے میں دیکھاں کے حرف معتر پر دادو چھیسین کی مہرگان تاںکھیوں سے باورپی خانے کی جانب دیکھنے لگتا کہ مجھے چائے پسند ہے۔ وہ چائے نہیں ہے، میں سے بہت سے لوگ دو دھمیں پنی ملکار کیا رہتے ہیں، بلکہ وہ چائے جو انگریزی طرز پر بنائی جاتی ہے۔ طبلی انتظار کے بعد چائے کی جو

لیکن جب بھائی تھی کی چھوٹی اور شپر صاحب کی خالہ زاد بہن یعنی رخانہ قمر کا جوان المعری میں انتقال ہوا تو تم کے مارے پر چہرے کا نقشہ گزگیا اور آنکھیں چھلک آئیں تو میرے ذہن کے افق پر قص شپر رسول کا اٹپوایک دم سے زمین پر آگرا، ان کے چہرے پر جذبات کے انحصار کی تمام صورتیں ایک دم سے دکھائی دی چکیں۔

شپر صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز ایک دم سے دکھائی دی چکیں۔ 1970 میں ہوا اور ان کی پہلی کہانی "شوشاں گھمات" 1972 میں مراد آباد سے نکلنے والے ہندی ماسک "سائی" میں شائع ہوئی۔ اسی سال پہلی تقدیمی مضمون "آج کی کہانی کلا اور میرامت" کی اشاعت انجام چاہوئی سے نکلنے والے ہندی ساپتا کب "سورزم پر کاش" میں ہوئی۔ انہوں نے بچوں کے لیے نئیں بھی آنکھیں جو مختلف ریاستوں کے صاب میں شامل ہیں۔ ان کا ذہن چونکہ غول گوئی کے لیے مختص تھا، اس لیے غول کے طلاوہ ان کی تمام نگارشات نشر و نظم کی دوسری حیثیت ہو کرہے تھیں۔ ان کی غول روزنامہ "الجمعیۃ" 1973 کے خاص شمارے میں شائع کیا ہوئی، چھپنے چھاپنے کا سلسلہ دراز جتنا چلا گی اور وہ ہندو پاک کے منفرد مشہور شعر میں شارہ ہوئے۔ ان کی متعدد شعری و تحقیری کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور انہیں اعزازات و انعامات میں بھی نوازہ کیا ہے۔ شپر صاحب کو پوست گریجویٹ تدریس میں اور تھیڈن میں پہچیں سال سے زیادہ کا تجربہ ہے۔ اس دو ران انہوں نے پیغمبر پریہار پروفیسر کی تقریب کے لیے منعقدہ متعدد کمیٹیوں میں بھیشیت سمجھیکت ایک پرہت خدمات انجام دیں ہیں۔ مختلف مرکزی اور ریاستی یونیورسٹیوں کے متحانات میں مختصر کی ذمہ داریاں بجوبی نہماں کیں ہیں۔ وہ معہودہ ماسٹر آف فلاسفی اور ڈاکٹر آف فلاسفی کے اکاروں کے گمراہ رہ چکے ہیں۔ ابھی تو ان کی عملی و تحقیقی شباب کے مراحل طے کر رہی ہے، نہ جانے کتنے مدد و مصال کے تجربوں سے انہیں گزرنا ہے۔ اس درمیان کمی کمی تحقیقات ان کے قلم سے تم کے تجربہ کے تجربے کے کام آئیں گی کہ وہ شپر رسول ہیں اور حسن تحقیق حق کی روشنی سے دلوں میں پڑھنے اندھیرے کو دور کرنا ہے۔ چنانچہ وہ یہ کام اپنی تحقیقی مساعی سے غزوں، نہموں اور دیگر نگارشات کی صورت میں بخوبی انجام دے رہے ہیں کہ ان کے دم کو میں بھی گردش سے قرار نہیں ہے۔

شپر صاحب کے قرب و جوار میں نظر نہ آنے والے مکروہ فریب کی جانب بھی اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کے بغیر شپر صاحب کا مرقع ادھوارہ جائے گا۔ ان پر کتاب مرتب کرنے کا برا اخلاقیات میں خوش ہی میں جلا تھا کہ شپر صاحب جیسے بھولے بھالے بے ضردا ن اور بہترین شاعر نیز لا جواب استاد پر کتاب مرتب کرنا جو ہم کا کام نہیں، ان کے یکدوں نہیں بلکہ ہزاروں مدار اور دوست ہیں، لیکن یہی خوش ہی پر پانی پھر گی اور میں نے بہت جلد بھانپ لیا کہ دوستوں کا اصل چہرہ بھی ان کے رو برا آیا ہی نہیں (اس سلسلے میں بطور خاص مادران کوں یعنی علی گڑھ کے ماقبلن کا ذکر..... خیز چھوڑیے کہ بہترین شاعری اور شرافت کو عزیز اور نظری خلوصی کی چک دمک میں الٹھر رہے، بھی ان کے یچھے جھائے کی معمولی ای کوش بھی کی ہوتی تو عیاری و مکاری کا بچکا حصہ طبع پر گراں ضرور گرتا۔ آج بھی وہ گندی مٹی کے کھے اپنے تمام کمر و بہات پر پوچھ دالے شپر صاحب سے بالکل ہوتے ہیں تو دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ ●●●

شپر صاحب نے خندہ پیشانی کے ساتھ قول بھی کیا اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز میرے ہاتھ لگی۔

ان دونوں شپر صاحب شعبہ اردو کی صدارت کے علاوہ اردو اکادمی،

دہلی کے واکس چیزیں کی ذمے داری بھی بصرہ خوبی بھارے ہے۔ ان کی مصروفیت

میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود حق دوستان فہمان سے یچھے نہیں

ہٹتے۔ نتوں دوستان کی جوئی ٹھیک دکھائی دیتی ہے، اس میں پروفیسر عبدالرشید اور

پروفیسر احمد حفظہ دوہری سے پہچانے جاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالرشید زبان اور لغات

کے مسائل و امور کے واقعہ کار، کلاسیک ادب کے پارک اور تاریخ کے راز داں ہیں۔

اس لیے ادھر پھر دوں سے ان کی ٹھنی رہتی ہے، لیکن ان کی متواضع مراجی کے ساتھ

اوس داشتمان کے کھانوں کی اشنا اگریں خوبیوں کو ان کا گردیدہ بھی بنائے رکھتی

ہے۔ شپر صاحب جدید دور کے نمائندہ تو ہیں، لیکن ان کی جڑوں کا تاتا بانا ماضی میں

دور تک پھیلا ہوا ہے، چنانچہ ان کے اور شپر صاحب کے مزا جوں میں خاصی مطابقت

ہے۔ کلاسیکت پروفیسر احمد حفظہ کا اوڑھنا پہچونا ہے اور وہ میر قیمیر کے عاشق بھی

ہیں۔ ٹس ال الرحمن فاروقی کی طرح جدیدیت اور کامکیت کا خوبصورت امتراجن ان کی

شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ اس لیے شپر صاحب سے ان کی گاہ میں چھٹی ہے، ویسے

شپر صاحب دوست دار آدمی ہیں کہ ان کی گرہ رہیاں کی اچھی لوگوں سے اچھی ہے۔

شپر صاحب کے اردو اکادمی کے واکس چیزیں میں بھی کے بعد ایوارڈ یادگارانگان کی جو

یہیں فہرست آئی، اس میں جامعہ طیہہ اسلامیہ کی اساتذہ کا نام بالائی تھا۔ فرط

مرست و کامرانی میں ایوارڈ یادگارانگان ایسے چور ہوئے کہ جوش و خوش کے ساتھ ڈنگ کا

اهتمام و انتظام کر لیا۔ جس میں شپر صاحب کے علاوہ شجے کے دوسرے تمام اساتذہ

شال ہوئے۔ اس کے کچھ بھی دونوں کے بعد یہروں ملک یعنی قطر میں شپر صاحب کا

جشن منایا گیا اور الیارڈ سے بھی انہیں نوازا گیا۔ وہ ہندوستان و اپنے آئے تو ڈری کی

درجہ امتیاز کی ٹھنی، لیکن وہ ایسے ثابت قدم ہیں کہ کامپنی جگہ سے ٹس سے میں نہیں ہوئے۔

اس پر کسی صاحب نے چکلی لیتے ہوئے کہ شپر صاحب اپنی جیبوں میں تالا کر رکھتے ہیں۔ اسے میں لذب و انترا پر محظی کرتا ہوں، حق تو یہ ہے کہ وہ بھی احباب کی

ضیافت کرتے رہتے ہیں، لیکن ان کے تمام کاموں میں اختلال و گل شال ہوتا ہے۔

شپر صاحب مضبوط حواس کے مالک ہیں، اس لیے بھی حواس پاٹھ

نہیں ہوتے۔ گل شیڈ چیبوں سال کے طویل عرصے میں جسمانی تکلیف اور ہدیٰتی کوہتہ و

اضطراب سے عاری ان کا کاچھہ چیبوں سال کے جوان کا سالگارا ہے۔ سوڑی جاں، ہوکہ

خون والم اور شہدی سوچکی اور بینا کی انجمنیوں سے آنکھوں میں آنسوؤں کے ستارے

چھملا ہے۔ اس وقت بھی نہیں جب وہ شیانکا کے جانکاہ ہر دوں مبتلا تھے پا اس کے

کچھ بھر س بعد موصوف ہر چیز کی تکلیفوں سے ناج ناج چاہتے تھے۔ ان کے گھر میں

لکھتی ہی اموات ہو گیں، بڑے بھائی کی ٹھنل میں چودھری رضی الدین چلے ہیں،

بھائی میاں چدا کیا ہوئے کہ دل کا چمن داغ داغ ہو گیا اور پھر ای جان کے انہیں کی

بدولت دبا کچلا چودھری وجہ الدین اپنی چمک دمک دبابرہ حاصل کر سکا تھا۔ ان کی

عزیزیہ رخانہ قرمینوں ترپتے ہوئے آنکھوں کے سامنے دم تو گیں، بھی خالانے جوان

کی خوش دامن بھی چیزوں نہیں بلکہ رسولوں کی خدمت کے بعد اپنا مدد موڑ لیا، اس

وقت بھی شپر صاحب کے جذبات میں جنہیں نہیں ہوئی اور ان کی آنکھیں بے جس و

حرکت میونٹاریہ نہیں رہیں۔ مجھے لگنے لگا کہ سینہ شپر میں دل نام کی کوئی چیز نہیں ہے،

(موت کا اندر حافر شتہی تھا شاید)
”اور کیا کچھ دیکھنا باتی پچا ہے؟“
اس نے پوچھا، اور آئھیں بندر کر لیں

کیڑا

(ایک حادثے کے بعد نم بے ہوشی میں خلق ہوئی ایک نظر)

ہومو ارکٹس

ستیہ پال آندہ

وہ چار پاؤں پہ چل رہا تھا
ہزاروں صدیوں سے چار پاؤں پہ چل رہا تھا
وہ دیکھتا تھا
سبھی چندے
سبھی درندے
زمیں پہ چلکیے الی ڈی روح۔۔۔ جانور سب
اسی طرح اپنے چاروں پاؤں پہ چل رہے ہیں
ہمیشہ ایسے ہی دوڑتے ہیں، ٹکار کرتے ہیں، ٹھیٹھیے ہیں
وہ دیکھتا تھا کہ سب کچنے کا ایک ڈھبہ ہے
سبھی کل کا ناتات دھرتی ہے۔۔۔
دھوپ ہے، پیڑ ہیں، ہوا ہے
وہ اپنی دنیا سے مطمئن تھا

گروہ آواز کس نے دی تھی؟
وہ کون تھا، جس نے ایک دن اس سے پہ کھا تھا
میں ا؟ سماں پہ ہوں، اپنی گردان اٹھاؤ، نظریں
بلندیوں کی طرف کرو
میری سمت دیکھو
کریمی مخلوق میں اکیلے
تمہیں مری سلطنت کے وارث ہو
اہل ہوفڑ منصہ کے

نجانے کیسے زمیں سے نظریں اٹھائیں اس نے
نجانے کن قتوں سے اپنی کرکے غم سے نجات پائی
بھجنوڑا خود کو۔۔۔

اپنے اندر اس طرح داخل ہوا وہ

جیسے رستہ جاتا ہو

جیسے اس بھورے خلاکی

ساری پرتوں کو کئی صد پول سے وہ پھجاتا ہو

اپنے اندر دو رنگ جانے کی کیا جلدی ہے مجھ کو؟

اس نے خود سے پوچھ کر مٹھوں کو اپنی بل دیا

اور ہاتھ سے طرے کو کھداونچا کیا۔۔۔

پھر خود سے بولا۔ ”مرد پیچہ ہوں، مجھے جانا ہی ہوگا

کون ہوں میں؟ تیز میرا کیا ہے؟ کس دھرتی سے میں بیبا ہوں؟

آج مجھ کو جانا ہوگا کہ میری تیز کیا ہے۔۔۔

روک مت مجھ کو

مری بیبار نہ ہوں کے میسا، ذہن میرے

گندمی رنگت کی ہلکی دھنڈ کیدم

چھٹ گئی تو ایک منظر سامنے تھا

کلبلا تے لاکھوں کیڑے

تیرتے گدري ہی نالی میں، ذہن اپنی ہلاتے

دوڑ میں مصروف؟ گے بڑھ رہے تھے

کون تھے؟

تیز رواس قافلے کا وہ بھی شاید فرد ہی تھا

دوسروں جیسا، مگر ممتاز سب سے

”میرے پیچے کا بھی اک راستہ ہے۔۔۔

دوڑ میں اول رہوں میں

اور منزل پہنچ کر

بانیوں کے واسطے جھرے کارستہ بن کر دوں“

وہ بہت تیزی سے ا؟ گے۔۔۔ اور ا؟ گے۔۔۔ اور ا؟ گے

تیز کر منزل پہنچا

کھوں آئھیں

ایک ہی لمحے میں ساری زندگی دیکھے گا کیا تو؟

کوئی اس سے کہہ رہا تھا

اک غصیلی نظم ستیہ پال آند

تو کنا چاہتا ہوں
مری چشم بینا سے مگی تو کھلو
مجھ د کھنے دو
یہ کیا ہو رہے ؟
یہاں جنگ کی آگ میں جلتے مکون سے
بھاگ ہوئے مردوزن، صد ہزاروں
سمدر کی بے رحم لہروں میں غرق اجل ہو رہے ہیں۔
یہاں لاہول افراد بسار کر دھوں سے بچے کی خاطر
ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے ہیں۔
یہاں بے زبان باقیات زمانہ
ہمارے پاس ارماضی کی سب بے بدال یادگاریں
زمیں بوس بلے کے ڈھروں میں اونڈھی پڑی ہیں۔
یہاں بیسوں ناؤں فونہاں کے اٹھتے ہوئے کو
چمٹی نشود سے بر باد کرنے کی قربان گائیں کھلی ہیں۔
یہ کیا ہو رہے ؟

مجھا ب ن رو کو
کہ لئے لکھ رک
میں لقوہ زدہ وقت کے ٹیڑھے منھ پر
بہت زور سے تو کنا چاہتا ہوں

لگا اسے مجھے اک نئی نوح
اک نیا عید آب و گل سا وہ بن گیا ہو
تو اس نے گردن اٹھائی، دیکھا
کہ وہ سیدھا کھڑا ہوا ہے
زمیں ہے پاؤں تلے بگڑو در در در اوپر
ہوا ہے، یا آسمان ہے، لیکن
بلانے والا کہاں ہے ؟
اس نے ہوا سے پیڑوں سے، آسمان سے سوال پوچھا
مجھے بتا ک، مجھے وہ آواز کس نے دی چھی ؟

وہ کل کا چچا پایتھ سے سیدھا کھڑا ہوا ہے
بلانے والے کڑھوئے ہنے کے بُتن میں اس نے
زمیں سے اٹھ کر، واہیں اڑنے
خلامیں جیسے فلاخیں بھرنے
قرم کے ماتھے پہ انہیں آدم کا نام لکھنے
— کا حق جتنا یا ہے آگے بڑھ کر

مراد یہ ہے کہ سلطنت کی
اسے بشارت جو دی گئی تھی
اس الہیت کا جواز پایا ہے ----
اب بھی، لیکن
بھی بھی خود سے کل کا چچا یہ
(آج کا آدی) برابر پوچھتا ہے
مجھے وہ آواز کس نے دی چھی ؟
بلانے والا کہاں ہے آخر ؟

اللہ کا فرمان
لَقْتَ فِيَهِ مِنْ رَوْحِي (میں نے اس میں اپنی روح پھوکی
(کے سامنے ممتن شاید یہ تسلیم کیے جائیں۔ (س۔پ۔۱)

غزلیں

یاسمین حمید

مسلسل ایک ہی تصویر چشم تر میں رہی
چرا غ بجھ بھی گیا روشنی سفر میں رہی

رہ حیات کی ہر کنکش پر بھاری ہے
وہ بیکھی جو ترے عہد خضر میں رہی

خوشی کے دور تو مہماں تھے آتے جاتے رہے
ادای تھی کہ ہمیشہ ہمارے گھر میں رہی

ہمارے نام کی حق دار کس طرح ٹھہرے
وہ زندگی جو مسلسل ترے اڑ میں رہی

نئی اڑان کا رستہ دکھا رہی ہے ہمیں
وہ گرد پچھلے سفر کی جو بال و پر میں رہی

اتنے آسودہ ستارے نہیں اچھے لگتے
ایک ہی جیسے نثارے نہیں اچھے لگتے

اتنی بے ربط کہانی نہیں اچھی لگتی
اور واضح بھی اشارے نہیں اچھے لگتے

ذرا دیسی ہو تو خوبیوں بھلی لگتی ہے
آنکھ کو رنگ بھی سارے نہیں اچھے لگتے

پاس آ جائیں تو بے نوری مقدر ٹھہرے
دور بھی اتنے ستارے نہیں اچھے لگتے

اپنی گناہ کے صحراؤں میں خوش رہتی ہوں
اب مجھے شہر تمہارے نہیں اچھے لگتے

جن عظیم شخصیات کی بدولت ارود دنیا میں اللہ آباد
کی ادبی حیثیت کو مزید استحکام حاصل ہوا ان میں ایک نام
پروفیسر غلی احمد فاطمی کا بھی ہے۔
ان کی درج ذیل کتاب اہمیت کی حامل ہے:

غزل

یامین حمید

سر سید اور ہم

علی احمد فاطمی

(9415306239)

انتساب اللہ آباد یونیورسٹی کے وائی ریاستر تاریخ کے بڑے
اسکالر، فنکر، دانشور اور شاعر پروفیسر رن علی ہانگو کے نام ہے۔

یہ کتاب

سر سید اور ہم

سر سید اور سیکولرزم

سر سید۔ ترقی پسند فقادوں کی نظر میں

سر سید۔ چند غیر مسلم دانشوروں کی نظر میں

عبدالحیم شر را اور سر سید احمد خاں

حالی اور سر سید۔ قرب اور بعد کے درمیان

سر سید کے خطوط

سر سید پر چند نئی کتابیں

اثر و یو۔ پروفیسر رن علی ہانگو

جیسے اہم عنوانات سے مزین ہے۔

ضخامت، قیمت ہے:

۱۵۲، ۲۰۰ روپے ہے۔

مثال عکس مرے آئے میں ڈھلتا رہا
وہ خد و خال بھی اپنے مگر بلتا رہا

میں پھروں پر گری اور خود سنبل بھی گئی
وہ خامشی سے مرے ساتھ چلتا رہا

اجلا ہوتے ہی کیسے اسے بجاوں گی
اگر چنان مرا تا بہ صبح جلتا رہا

میں اس کے معنی و مقصد کے سنج چنتی رہی
وہ ایک حرف جو احساس کو کچلتا رہا

زمیں خلوص کی مٹی سے بے نیاز رہی
رفاقتوں کا شہر وادیوں پر پلتا رہا

نظمیں

عشرت معین سیما

خاموشی کے رنگ

زمیں سے آسمان تک خوف ہن کر
خموشی کے حسین لفظوں کو سن کر
حر میں ہیں مرے خاموش جذبے
مری سوچوں کا گہرا جال ہن کر
کسی نظرؤں کا جادو بولتا ہے
کہ تو خاموش رہ کر بولتا ہے

دیس کی یاد

پرندہ ہے فنا میں ڈالتا ہے
فلک اپنا درپیچہ کھوتا ہے
ہوا بھی کچھ ترانے کا رہی ہے
کوئی غنچہ خوشی سے ڈالتا ہے
تری یہ شوخ نظریں کہہ رہی ہیں
کہ ٹو خاموش رہ کر بولتا ہے

سونے چاندی اور ہیروں کا رکھا ہے سامان دہاں
تب ہی تو ہر گھر کے باہر بیٹھا ہے دربان دہاں

کا گا بھی دیوار پارپنے پر پھیلائے سوچتا ہے
پیار سے خالی گھر ہے کیسے آئیں گے مہمان دہاں

چڑیا ، باش اور ہوا کے تازہ جھوکے بھول گئے
ایک زمانے میں ہوتے تھے گھر میں روشنداں دہاں

شام ڈھلے جب پڑھ کے بیٹھی تھا گھر کو آتی تھی
ہر اک موڑ پر عزت کے رکھوائے تھے انجان دہاں
دروازے پر کنڈی یا بوسیدہ پرده ہوتا تھا
ایسے دور میں سب سے مہنگا ہوتا تھا ایمان دہاں
مہماں اور مسافر کوئی بہتی میں آ جاتا تو
جل اٹھتے تھے چوبیے گھر کے ساتھ میں آتش دان دہاں

کوئی شہنائی دل میں پھوٹی ہے
خموشی چیسے لب پر ٹوٹی ہے
گلابی پنکھڑی پر ہر نظر اب
ہمارے دل کی دنیا ٹوٹی ہے
کوئی خوبیوں کے یہ در کھوتا ہے
کہ تو خاموش رہ کر بولتا ہے

سر ساحل تلاش ابر نیسان
گھر بننے کو یہ حرف پیشان
تلاشِ موضوع رنگِ خن کے
مضامین ہو گئے چیسے گریزان
سکوت بحر شب بھر ڈالتا ہے
کہ تو خاموش رہ کر بولتا ہے

خوش لب پسلام آخر
تم خدا کی!
میں بھول جاتی
اگر دسمبر نہ لوٹ آتا

مجازی خدا

چار ٹکوں کا شوقِ مکان کیا بنا
نمیتِ غربِ افغان بھی جاتی رہی
اس کا ذوقِ تہذیب کنے کا
خپڑوت کی دیوار اونچی کیجئے
حرمتِ بندرگی کو پھیلارہا
سجدہءِ عشق پامال کرنا رہا
وہ تقاضائے منصبِ مجازی خدا
جو خدا ان کے جنت پھانس کا

خوشیاں دے کر خوشیاں پانا ایک روایت ہوتی تھی
دکھ بھی سب کا سائبھا ہوتا جب ہوتا نقصان وہاں
عزتِ دولت اور کہیں سے نام کما کر بھی اکثر
دھرتی مار ہی سب بیٹوں کی ہوتی تھی پچان وہاں

اب تو بیشمام گئے جب لوٹ کے گھر آجائے ہیں
آجائی ہے سہی ماں کی اگلی جان میں جان وہاں

غالب میر اقبال ہمارے درٹے کے رکھوائے تھے
اردو تھی تہذیب ہماری ہم تھے اُس کی شان وہاں

بیچپن میں وہ تارے گناہِ گھور اندھیری راتوں میں
سپنوں کا آباد تھا کیسا پیارا ایک جان وہاں

ڈھوک کی ہر تھاپ پہ دھڑکن نام اُسی کا لیتی ہے
دلیں پرائے جانے والا چھوڑ گیا ارمان وہاں

سیما یادِ وطن کی اپنے ساتھ ہمیشہ لاتی ہے
آنسو میری آنکھوں میں اور ہونتوں پر مسکان وہاں

پہلی مسی کے حوالے سے

"گھر کی ماسی کے نام"
میں گوئی بن کر اب اپنے کانوں میں بس گئی ہوں
میں اپنی سانسوں میں بن کجھشو
بس اپنے اندر ہی ڈھل گئی ہوں
میں لمحہ سجننا چاہوں
میں قطرہ قطرہ پکھل گئی ہوں
میں جانتی ہوں کہ جو ٹوپیں کی کھنک میں میرا
سراغ و نشہ نہیں ملے گا
مرے تصور کو گیت گاتا کوئی بھی لمحہ نہیں ملے گا
ذہن کے پردے پر قص کرتا اور گیت گاتا
کوئی بھی لمحہ نہیں ملے گا
یہ میری آوازیں میرے
نفع

آخری لمحہ فرقہ

وہ معدرات کی ٹنگاہ اُس کی
وہ چشمِ نرم میں پیعامِ آخر
جادیوں کا وہ تختِ منتظر
خوش رستے پاٹک و آپیں
وہ رخصتِ دم اداں آنکھیں
عجب نہامت سے بھیگی پلکیں

اے دیدہ ۱ تر رہک قر عید مبارک
اے جان چکر، نور حیدر عید مبارک
زخت سفر، بارود عید مبارک
اے شیریں شہر نور نظر عید مبارک

بر تنول کی لکھک میں دب کر ہی مر گئے ہیں
میں سانوں کی عجب سی خوشبو میں بس گئی ہوں
میں وقت کے بھاری بیبنوں میں دبی ہوئی تملار ہی ہوں
میں اپنے خواب وہنر کی روٹی پکار ہی ہوں
زمیں کو پوچھا لگا رہی ہوں
پکھدار غدوہ اور مثار ہی ہوں

رشتہ ازدواج

تم سے میرا رشتہ ایسا
جیسے آنکھ اور ہاتھ
ہاتھ میں کوئی چوت گلتا تو
روپتھی ہے آنکھ
آنکھ سے گرا نہیں تو
پوچھیں ان کو ہاتھ
جان سے پیارا ہے سیما کو

کھسی ہوئی اور پٹھی لکیروں میں ڈھونڈتے ہیں
تو کچھ ستارے پلک سے گر کر مرے مقدر کو چوتے ہیں
میری ساعت میں چین بن کر یہ گونجتے ہیں
میں گونج بن کر اب اپنے کانوں میں بس گئی ہوں!

عید مبارک

اے بوئے فضا، رگِ حنا عید مبارک
اے روئے وفا، ناز وادا عید مبارک
اے مشکِ صبا، رقصِ ہوا عید مبارک
اے لالہ قبا، قلبِ دعا عید مبارک

اے مشکِ بدنا، شیریں دہن عید مبارک
اے سرگن، ریکِ چون عید مبارک
اے غنچہ ۱ تن، بعلی یمن عید مبارک
اے شیشہ بدنا، جان چون عید مبارک

سیلا ب کے ایک طوفانی ریلے کا اپنے رب سے شکوہ
سمدرروں میں کہیں پر چھپا دیا ہوتا
زمیں کی گود میں اس کو سلا دیا ہوتا
جہاں زمیں ترستی ہے خوش خوش کو
دہاں پر رحمت باراں بنا دیا ہوتا
بانے والے پیسا لاب، غصب پانی
کسی کی آنکھ سے تو نے بہا دیا ہوتا
کسی کی پیاس بجا تا تمذق توں میں کہیں
کسی کی جھوٹی سمجھوتا عابد توں میں کہیں
زمیں کی گود پر رکھتا تو اپنے بادل سے

اے گیسوئے شب، جشن طرح عید مبارک
اے رگِ خن، حاصل شب عید مبارک
اے محظی شب، فرط سب عید مبارک
اے شمر و ادب، غنچہ ۱ لب عید مبارک

زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثالث

اقبال حسن آزاد

مدیر اعزازی

ثالث آفاق صالح

مدیر

گلوں کو پسچار گب اداۓ کول سے
کسی کے ماتھے پلہراتا موتی محنت کے
کہیں خوش کایی آنسو بنا دیا ہوتا
بنانے والے یہ سیلاپ یہ غصب پانی
کسی کی آنکھ سے تو نے بہار دیا ہوتا

تorkhtahjri اک موج میں نہاں اُس کو
تorkhtaznagi کر کے روائی دواں اُس کو
اگر تو اس کو عطا کرتا ہشم نادم کو
تو ٹکوہ کرنا کہاں دیتا زیب خادم کو
زمیں ہوتی ہسین آج تیری جنت سے
اگر لاتا نہیں تو ہمیں قیمت سے
تیرے حضور مجھے کوئی نگلا ہوتا
بنانے والے یہ سیلاپ یہ غصب پانی
کسی کی آنکھ سے تو نے بہار دیا ہوتا



قیمت فی شمارہ: ۱۵۰ روپے (رجڑڑاک سے ۱۵۰ روپے)
سالانہ: ۲۰۰ روپے (رجڑڑاک سے ۲۰۰ روپے)
خصوصی تعاون: پندرہ ہزار روپے یا تین سو امریکی ڈالر
جن مالک میں western union یا انگریز گرام کی سہولت ہے دہلی سے
درج ذیل پتے رقم بھیجا سکتی ہے۔
TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای میل پر بھیجا سکتی ہے۔

eqbalhasan35@yahoo.com
سالانہ بمرہب کے لیے ہندوستان کے کسی بھی بھائیانکی لائزنس کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجا سکتی ہے۔

Eqbali Hsan Azad

Allahabad Bank

Jamalpur Branch

A/c 20962191966

IFSC Code- ALLA0210009

Mob.+91 9430667003

email: eqbalhasan35@yahoo.com

www.salismagazine.in

عشرت معین سیما

آن لائیں مشاعرہ پڑھنا، فیلی کے ساتھ ناپ و رڈس گم
کھلیانا اور سرد موسم میں سوچی کا حلہ بنانا اور کھانا اس ویک
اینڈ پر گھر میں مصروفیت ہی نہیں انجوائے منٹ بھی رہی۔
اس وقت گھر میں رہنا صرف آپ کا تحفظ نہیں بلکہ معاشرے
کا تحفظ بھی ہے۔ انگھر والوں کے ساتھ مصروف رہنا وقت
کی ضرورت اور قتنی آسودگی کا سبب ہے۔

غزلیں

صغریہ مدائنی

اکی خواہش ہے محبت کا میں نوحہ لکھوں
اور پھر گھرے سمندر کو بھی پیاسا لکھوں

آج سوچا ہے لکھوں ایک غزل اس کے لیئے
اور غزل میں بھی محبت ہی کی چچا لکھوں

اس شش و پنج میں گزرے ہیں کئی روز مرے
لکھوں منزل یا اسے گم شدہ رستہ لکھوں

میں جو خود اپنے نقاش ہوں بتاتا سب کو
کیسے مکن ہے زکے پانی کو دریا لکھوں

اس سے ملنے کی طلب کا یہ متوجہ لکلا
میرے بس میں ہو تو امروز کو فردا لکھوں

جسکو دیکھا ہی نہیں دل کی ٹھاہوں سے کبھی
کیسے اس شخص کا تلاوہ سراپا لکھوں

فیصلہ آج بھی صدر نہیں ہوتا مجھ سے
اسکو امید لکھوں پھر یا تمنا لکھوں

رابطہ رکھنے میں دشواری ہے کیوں
شہر بھر میں قحط دلداری ہے کیوں

پوچھتا احوال کوئی نجم ہے ؟
لفظ دو لکھنے کی لاچاری ہے کیوں

اک زمانے بعد دیکھا ہے تجھے
استدر چھرے پر بیزاری ہے کیوں

جو گھہ شگوہ ہے کہہ برسوں کے بعد
دل کے آئینے میں زیگاری ہے کیوں

دوستوں کا بھی کوئی پوچھو مزاج
ڈھنبوں کی ناز برداری ہے کیوں

بربط دل کے سلکتے تار پر
نام تیرا آج بھی جاری ہے کیوں

کوئی تو صدر کرے یہ مکشف
وقت کا سکے یہ عیاری ہے کیوں

پر چھائیاں

(کہانیوں کا مجموعہ)

ارمان سمشی

۲۰۱۷

۱۵۰ روپے

۸۵، خواجہ دیوان فرست لین (لال باغ) پا نچوی
منزل، ڈھا کہ۔ ۱۲۱۔ بیگلہ دیش

ہزار بار تشکر ہے تیرا ربِ کریم

کہ دے کے لوح قلم مجھ کو سرفراز کیا

ذکیہ شیخ مینا

عکس خیال

(شاعری)

ذکیہ شیخ مینا

۱۹۱۹ جون

۱۷۵ روپے

7715964647

سبق اردو

فساد اور دیگر نظمیں

مراٹھی نشری نظموں کا اردو ترجمہ

شاعر

ڈی۔ کے۔ شیخ

متترجم

اسلم مرزا

۲۰۱۹

۲۰۰ روپے

رابطہ متترجم

9552843365

نظم اور ۲ غزیں

غزل

سلیمان خمار

سلیمان خمار

روح کی پیاس

غزل کے فن میں اپنے عہد کے زبان رکھ دینا
نیا اسلوب رکھ دینا نئی بیان رکھ دینا
میں اپنی سوچ کی کھیقی ہری رکھتا ہوں ہر لمحہ
زوالی زندگی ہے مگر کو ویران رکھ دینا
مرا طرز پیاس وہ ہے کہ مصرے بول اٹھتے ہیں
مرا شیدہ نہیں الفاظ کو بے جان رکھ دینا
سمندر بے حاطم ہو سدا اچھا نہیں لگتا
پھر ان بے جان لمبیں میں کوئی طوفان رکھ دینا
فلسطین آپ کو مل جائے گا، جنت حکومت پر
صلاح الدین ایوبی سا اُک سلطان رکھ دینا
اندھیرے اب بھی چھائے ہیں، ابھی کچھ رات باقی ہے
ہر اک نوک قلم پر اب بھی اعلان رکھ دینا
زمانے کو بہت اچھی طرح معلوم ہے سب کچھ
کے جھلانا اور کس کو قریب جان رکھ دینا
جھلستی ریت ہی لپٹا رہے گی پاؤں سے کب تک
ہماری زیست کے صحراء میں نخلستان رکھ دینا
میرے لب تو خدا یا مسکراہست سے رہے عاری
مرے بچوں کے ہونٹوں پر مگر مکان رکھ دینا
ہمارے دور کی تصویر کوئی دیکھنا چاہے
تم اُسکے سامنے یارو مرا دیوان رکھ دینا
میں اپنی بات میں بچ بولنے کا جرم رکھ دوں گا
تم اپنے فیصلے میں قتل کا فرمان رکھ دینا
خمار اہن علی کی طرح بچ حق و باطل میں
نہیں آسائیں ہیتلی پر جا کر جان رکھ دینا

میں تمہیں
کس لئے پیار کرتا ہوں
تم
بہت خوب رو ہو۔۔۔۔۔ نہیں
بہت بادفہ ہو۔۔۔۔۔ نہیں
تم مجھے چاہتی ہو۔۔۔۔۔ نہیں
یہ تسب
کھو کھل لختا ہیں
اور سنو:
مرے پیار کی اصل بنیاد یہ ہے
کشم
مری کوئی پہلی
مری روح کی پیاس ہوا!

اشاعت کا ۳۵ سال

شمارہ نمبر: ۷۱

سہ ماہی

ابتساب عالمی

سرنوخ

ترتیب

ڈاکٹر سیفی سرونجی

مدیر

آفاق سیفی

۱۰۰ روپے

چارشمارے ۲۰۰ روپے

سیفی لابریری، سرونج، ۳۶۳۲۸۲۸

غزل

سلیمان خمار

اس ایک سوچ میں گم ہیں خیال جتنے ہیں
جواب اُتے نہیں ہیں سوال جتنے ہیں

جو سازشوں کو کچلتے کی بات کرتا ہے
بُنے ہوئے ہیں اُسی کے یہ جال جتنے ہیں

اُسی کی دین ہیں یہ سب اُسی کے تھے ہیں
ہماری فکر کے ششے میں بال جتنے ہیں

ہمیں نے چیختے مسائل کی میربانی کی
ہمیں نے پال رکھے ہیں وہ بال جتنے ہیں

تمہاری بزم ہے آباد خوش مزاجوں سے
ہمارے ساتھ ہیں آشنا حالت جتنے ہیں

ہمارے عہد میں لفظوں نے کھو دیا مشہوم
عروج بن کے کھڑے ہیں زوال جتنے ہیں

یقین نہیں ہے تحفظ کا اب کسی کو خمار
ہر ایک ذہن میں ہیں اختلال جتنے ہیں

ترے احساں سے جانا! کبھی میرا گزر ہوتا
نہ ہوتے بھر کے سائے نہ ہی میں در بدر ہوتا

اردو کے اہم ادبی جرائد کے اولین شمار

ڈاکٹر اسد فیض

صورت ہے۔ جو نیاز فتح پوری کے اعلاء شعری ذوق اور اخترائی ذہن کی علامت ہے۔ اس تخلیقی اور احساس؟ فریں نظم کا؟ خری شعر ہے۔ ان خدھہ بھائے حسن کی کرتا ہوں قائم پیداگار یعنی ان پھولوں کا ہے چھوٹا سا گلدنست نگار ”عناصر نگار“ کے عنوان سے نیاز نے اداری لکھا ہے اور ”نگار“ کی اشاعت اور اس کی غرض و غایبی پر روشی ذاتی سے نظری مضمون میں پہلا مضمون شعر (عربوں کے نقطہ نظر سے) ہے جو نیاز فتح پوری کا لکھا ہوا ہے۔ جس میں شاعری اور شعر کی داستان کو قلم کیا گیا ہے۔ اس میں تمام دیگر اقسام اور زبانوں میں بھی شاعری کے معانی اور ارتقا پر روشی ذاتی گئی ہے اس مضمون سے اندازہ ہوتا کہ نیاز تحقیقی مزانج بھی رکھتے تھے۔ فلشن کی ذیل میں ”سمنستان کی شاہزادی“ کے عنوان سے لطیف الدین احمد کا ایک افسانہ شائع ہوا ہے۔ احمد کا اسلوب سجاد حیر بیدرم کے رنگ سے ممالکت رکھتا ہے، کہانی دلچسپ اور فرمیم شہزادے شہزادے بیویوں کے قصے پہنچتے ہے۔ اگلے صفات پر نیاز فتح پوری کا ایک مضمون ”کیا مانی واقعی مصور تھا“ طبع ہوا ہے جس میں مانی اصلیت کے بارے میں تھیں کی گئی ہے اور اس کے نسبت کے بارے میں معلومات پیش کی گئی ہیں۔ ”صرح اکے موئی“ کے نام سے قرآن قریک ایک کہانی اس شمارے کی زینت ہے۔ یہ عرب معاشرت سے متعلق ہے اور ایک لڑکی کی بے مثال قربانی سے عبارت ہے۔ ترکی ادب سے ماخوذ گیوں“ کے عنوان سے نیاز اور ”طریبہ“ کے نام سے امتیاز علی تاج کی رشقات قلم بر صغير میں ترکی ادب کی مقبولیت اور نثر کے رومانوی اسلوب کے صریح و رکھنی انداز کی خوبصورت جملکیاں ہیں۔ نظر کے دیگر مضمون میں جو نیاز فتح پوری نے لکھے۔ ان میں ”جرم“ حرب و تجارت کا ایک عجیب راز، معلومات حرکت زمین کا مشاہدہ یعنی، اشتراکیت کے عنوان سے تمام معلوماتی مضمون نیاز فتح پوری کے نتیجہ ففر کے مر ہوں منت ہیں۔ صفحہ ۵۵ پر ایک غلطی کا ازالہ کے عنوان سے نیاز نے علی گڑھ میگزین کی جو لائی کا اکتوبر اشاعت میں شہا کی شرح دیوان غالب پر ایک معاندانہ تبصرہ سے اپنی لاتھی کا اعلان کیا ہے۔ مضمون کے؟ خریں صرف فتح پوری از بھوپال شائع ہوا ہے۔ انہوں نے ایڈیٹر شید احمد صدیقی سے ٹکار کے صفات کے قسط سے استدعا کی ہے کہ اس مسئلہ پر روشی ذاتیں۔ نگار کے اس شمارے میں چھپتے والی مظہمات بھی معیاری ہیں۔ ”فروغ نظر“ کے عنوان سے ضیائی، ”شام جن“ کے نام سے مخوار کہرا جادی جن کا اصل نام سید محمد محمود رضوی ہے ان کی ایک نظم، ”اندر پرستش“ کے عنوان سے صفحہ ۳۹۔ ۰۲ پر ایک فارسی نظم، ”بہار کی دیوی“ کے عنوان سے نیاز فتح پوری کی نظم اس شمارہ کا قابل قدر

بیسویں صدی کی ابتدائی دھائیوں میں صغير کے اہم ادبی مراکز سے ادبی جرائد کی اشاعت کا سیلاب آئنا ہے۔ اسی جرائد نے صغير کے ادبی معاشرہ کی علی اور گلری بنیادیں استوار کیں اور ان کو اسی چشماغوش اپنے عہد کا شکور اپنے اندر سیئے ہوئے یہ ادبی رسائل ہمارا عظیم اناشیں ہیں۔ اج کے کئی معروف ادبیوں کی ابتدائی تحریک پروں اور علی اور گلری تحریکوں کے بھی یہ جرائد میں ”محبت ہند“ دہلی کو اردو زبان کا اولین ادبی جریدہ قرار دیا ہے۔ اس کا رسالہ ”میں“ میں ”محبت ہند“ میں ایک مضمون ”اردو کا اولین اجرا جون ۱۸۷۴ء ۱ میں ”عجل میں؟ یا (۱)۔ یہ ہر ماہ دہلی سے جھوٹی تلطیع کے پچاس صفحات کی ختمات میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر ماسٹر رام چندر (۱۸۷۱-۱۸۸۱) تھے جو دہلی کا لمح میں علم ریاضی کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے کئی کتب تالیف کیں۔ ان میں چنار دوز بان میں بھی تھیں۔ رسالہ ”محبت ہند“ میں بہادر شاہ ظفر، شاہ نصیر کی غریب اور مونوں کی شاعری بھی شائع ہوتی رہی۔ یوسف خاں کمبل پیش کا سفر نامہ کئی شماروں میں قحط و ارطیح ہوا۔ اکتوبر ۱۸۷۹ء ۱ کے شمارے میں یوسف خاں کمبل پیش کی شہیہ بھی شائع کی گئی۔ رسالہ محبت ہند سے اب تک ادبی جرائد کی اشاعت کو ایک سوابھ مرس کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس دوران جن رسائل نے اپنی منفرد اشاعتوں سے ادبی تاریخ پر ایادگار نقوش بثیت کیے۔ ان میں ایک اہم نام نیاز فتح پوری کے ادبی جریدہ ”نگار“ کا ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی کی ابتدائیں اس ادبی جریدہ نے ہندوستان میں ایک دیستان اور تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی اور اس کے موضوعات اور اسلوب تشریف ادب کی رومانوی تحریک کی تقویت کا باعث بنے۔ ”نگار“ کا پہلا شمارہ فروری ۱۸۷۹ء میں ایک گردہ سے شائع ہوا (۲)۔ اس شمارہ کے سرور ق پر رکھنی اتحریر کے عنوان سے نیاز فتح پوری کا نام درج ہے۔ جبکہ اندر وہی صفات سے پتہ چلتا ہے کہ مخوار اکبر؟ بادی بھی ان کے ساتھ معاون مدیر کے طور پر شامل تھے۔ نیاز فتح پوری (۱۸۷۹ء-۱۸۸۱) تاریخ ساز ادبی شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنے عہد کے ادبی، نمہجی اور تہذیبی مظہراتے پر ایسٹ نقوش بثت کئے۔ ٹکار بنت ہمان ترکی کی ایک انشائی شاعری تھی۔ نیاز اس کی انقلابی اور رومانوی شاعری سے متاثر تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کے پر نکال کا اجزاء ۱ کیا۔ نیاز فتح پوری اس وقت تک افسانہ ٹکار کے طور پر شہرت حاصل کر چکے تھے لیکن ٹکار کے تجدید علی م موضوعات کا صحیح معنون میں تر جان ثابت ہوا۔ ٹکار میں انہوں نے اخلاق و حکمت سے لے کر علم نجوم، نمہج، ادب، سیاست، معاشرت اور جنس تک کے موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔ پہلی شمارے کے کل صفحات اسی (۰۸) میں۔ پرچہ کی ابتدائی مظہوم انتساب کی

ہندوستان بھر سے اہم خبروں اور واقعات کو بھی شائع کیا گیا ہے۔ ان شذرات سے اس دور کے سیاسی و معاشری حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ تحریک خلافت کے حوالے سے تحریر ہے۔

”سیاسی سرگرمیوں اور مسئلہ خلافت کے حل میں مسلمانوں کے کامل دس سال صرف ہو چکے ہیں ہماری بدقسمتی ہے کہ مسئلہ خلافت ہنوز روز اول کا مصدقہ ہے اور بلاشبہ اس کی ضرورت بھئے یا اس کے متعلق حقیقت کام کرنے کا وقت اب؟ یا ہے۔ گزشتہ دس سال کی سیاسی سرگرمیوں سے ہمیں کوئی نیا یاں فائدہ نہیں پہنچا کیونکہ ان سرگرمیوں کا انجام ہنوز مسلم ناقہ کی صورت ظاہر ہوا ہے اور تمام ملک میں کاٹکیں کیٹکیں کی جگہ سماحت شہدی اور مہابیر دل وغیرہ جماعتوں نے لے لی ہے۔ قومی اخبارات کی جگہ ہندو مسلمانوں کو ٹوڑانے اور گالیاں دینے کے لئے نویں ظریفانہ خبروں کا ظاہر ہوا ہے۔“ (۷)

شذرات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی کی دوسرا دھائی کے مطہر میں پنجاب میں طاغون کی وبا نے بے حد جانی نقصان کیا اور اس کا زیادہ تر ہکار مسلمان ہوئے۔

اس شمارے کی واحد افسانوی تحریر بلقیس خاتون جمال بنت مولوی عبدالاحد کا ایک فسانہ ”عصمت کی دیوبی“ ہے یہ افسانہ ہندوستانی عورت کی عزت و عصمت کے لئے قربانی اور پتی اور تکا ایک بے مثال خوندہ ہے۔ جس بھی سے دیوبناؤں نے اسے ”عصمت کی دیوبی“ کا خطاب دیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک ہندو عورت تکوتا ہے۔ اس شمارے کے دیگر معلوماتی اور خوبصورت مضامین میں ملک عبدالقیوم کا ترکوں کی معاشرت، دینی مضامین میں مولانا محمد عبداللہ کا مضمون ”حسن معاملت“، ایک مسلمان کے قلم سے ایک گلائیز مضمون ”عقل“ میں اس دور کے مسلمانوں کی حالت زار کویں بیان کیا گیا ہے۔

”مسلمانوں کی موجودہ پستی اور خزل و کمزوری محسن کام نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ مسلمان باشی بہت کرتے ہیں لیکن کسی نظام و ضابطہ کے مختصر کرنا ان کے لئے حوال ہے۔ قوم کی جہالت و لعلی کو دور کرنے کے لئے یعنی نظام پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ قوم کی مالی کمزوری پوک کو دور کرنے کے لئے قوم کو تحریقی و صفتی کاموں میں حصہ لینے کی حاجت ہے۔“ (۸)

عبد الرحمن جنتی جن کو اس شمارے میں ہندوستان کا بے ناز مصور کہا گیا ہے۔ ان کے فن کا نمونہ ایک مصورانہ کاوش ”لٹلی کا تھنے“ اور تحریر تحریریں پہ عنوان ”جزای شراب“ اور ”راوی“ بھی شامل ہیں۔ ایڈیٹر نے اس پر ایک مختصر شذرہ تم کیا ہے اور اس اسلوب پر شکر جو لکھنی عبارت سے معمور ہے عبد الرحمن جنتی کا خاص مصورانہ اسلوب قرار دیا ہے۔ محمد دین تائیگ کا ایک مضمون ”فلسفۃ اقبال“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس انہوں نے ملائم اقبال کی فکر کو مشرقی تاثر میں پیش کیا ہے اور معتضیں کے اس اعتراض کو رد کیا ہے کہ اقبال کی فکر کا مأخذ مغربی افکار ہیں۔ اس شمارے میں ایڈیٹر حکیم یوسف حسن کا ایک مضمون ”میں کون ہوں“ کے عنوان سے طبع ہوا ہے۔ یہ مضمون انسان کو محنت اور عمل کا درس دیتا ہے۔ اس میں قومی اور انفرادی سطح پر کام کی اہمیت کو ابھار کیا گیا ہے۔ ”گل صدر گل“ کے عنوان سے ہندوستان کے اخبارات و

حصہ ہیں۔ اس شمارے کی واحد غزل شوکت علی فانی کی تحریر کردہ ہے جس پر ایڈیٹر نے ایک طویل نوٹ لکھا ہے۔ مجھوں طور پر ”نکار“ کا یہ شمارہ اس دور کے ادنیٰ مزاج کو کھٹکے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ خاص طور پر اس شمارے کی وساطت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نیاز اپنے عہد کی نایاب روزگار خصیت تھے جنہوں نے ادب میں اپنی الگ پہچان بنائی۔ ۲۶۹۱ء سے ٹگار ہائیکورس کے نام سے کارپاتی سے تسلیم کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس کے ایڈیٹر اور پہلا اور اکٹھر فرمان فتح پوری کی شخصیت کی چھاپ نہیں ہوتا ہے۔ جس پر اتنا میں یازدی اور اب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت کی چھاپ نہیں ہوتا ہے۔ اس کا رہنماء یادگار حیثیت کا حال ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کی دوسرا دھائی میں ایک اور ادبی جریدے نے بھی مجلاتی صحافت کوئی راہوں اور مزاج سے اجتناب کیا۔ اس کا نام ”نیر گل خیال“ ہے۔ ”نیر گل خیال“ کے مالک مدیر حکیم یوسف حسن تھے۔ وہ افسانہ نویس اور طبیب بھی تھے۔ وہ ۳۹۸۱ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لاہور میں پائی۔ میل پاس کرنے کے بعد ریلوے میں بطور گذش کلرک ملازم ہو گئے تھے۔ لائل پور میں بھی تعلیمات رہے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدائی افسانہ نگاری سے کی۔ ان کے افسانے ”نیر گل خیال“ اور ”زمان“ کا نام پور میں شائع ہوتے رہے۔ جو اس زمانے کا ایک مقبول ادبی جریدہ تھا۔ حکیم یوسف حسن نے ”نیر گل خیال“ کا اجر جولائی ۲۲۹۱ء میں لاہور سے کیا (۳) ان کے ساتھ محمد دین تاشیر (۲۰۹۱ء-۲۰۵۹ء) بھی جانشہ ایڈیٹر کی حیثیت سے تحریر کر سکتے۔ حکیم یوسف حسن کا کہنا ہے کہ ”نیر گل خیال“ کا نام حکیم فقیر محمد چشتی نے تجویز کیا تھا اور اس کا نایکل بھی حکیم فقیر محمد چشتی نے بیانی تھا (۴) پہلے شمارے کا سائز ۱۳۲x۳۳ اور اس کے کل صفحات پچاس تھے۔ علامہ اقبال نے ”نیر گل خیال“ کی اشاعت پر اس کے ایڈیٹر کو ایک خطاء اگست ۲۲۹۱ء کو تحریر کیا۔

”رسالہ نیر گل خیال جو حوال ہی میں لاہور سے لکھنا شروع ہوا ہے۔ بہت ہو ہمارا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مضامین میں بھجتی اور رہنمائی پانی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ پنجاب میں بھجتی ادبی مذاق پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہو گا۔“ (۵)

پہلے شمارے کا اداریہ ”قالا اقتاحیہ“ کے عنوان سے حکیم یوسف حسن نے تحریر کیا ہے۔ انہوں نے اداریہ میں لکھا ہم اسے تجارتی فوائد کے لیے نہیں چلا رہے گرہم تمام تجارتی اصولوں کے پابند رہیں گے تاکہ اس رسالہ کی زندگی محسن ایک رقص شر رہا بت نہ ہو۔ ان کا یہ خلوٰں شاہزاد قدرت کو اتنا پسند ا? یا کہ اس پرچے نے خاص نمبروں کی اشاعت کا رواج ڈالا اور علماء اقبال کی زندگی ہی میں ان پر ایک شاندار اور یادگار نمبر تسبیر۔ اکتوبر ۲۳۹۱ء میں شائع کیا۔ حکیم یوسف حسن کا انتقال ۱۸۹۱ء کو راولپنڈی میں ہوا۔ ان کی عمر نوے برس ہی (۶) حکیم یوسف حسن کا یہ فیضان ”نیر گل خیال“ جس نے پناہ اشاعتی سفر ۲۲۹۱ء میں شروع کیا۔ جس بھی جاری و ساری ہے۔ اب سلطان رنگ اسے راولپنڈی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پہلے شمارہ کے مشمولات میں مضامین کا حصہ بے حد معیاری اور معلوماتی ہے۔ ابتدائی صفحات میں ”شذرات“ کے عنوان سے

صفات میں دنیا میں مختلف حوالوں سے دئے گئے اعداد و نتائج سے مسلمانوں کی ا؟ بادی کا تخفینہ لگانے کی سیکی گئی ہے اور تحریر کیا گیا ہے۔
”اس جدید حساب کی رو سے مسلمانوں کی تعداد ۹۸۹۳۱۸۳۲۲ ہے۔ جس میں سے دن کروڑ ستاون لاکھیں ہر اگر یہی جنڈے تھے ہیں“ (۱۰)

”مرقع الاحزار“ کے تحت واقعات حاضرہ کے حوالے سے ہاتھ سے بنائی گئی تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔ جن میں سے ایک محمد علی جناح صدر اجل اٹھیاں مسلم لیگ (۲) نازی کی بے جو مسئلہ موصل (۳)؟ غامحمد صدر استقبالیہ کمیشی۔ صفحہ ۱۵۱ پر ایک ادبی جزیدہ اور ایک گلہستہ کا اشتہار بھی شائع ہوا ہے۔ ان میں ایک لکھ لاؤ ہو رہا ہے اور اسے شائع ہوتا ہے اور اسے ہندوستان بھر کا جزو اکمال ہے جو عرصہ سے لا ہو رہے شائع ہوتا ہے اور اسے ہندوستان بھر کا واحد گلہستہ قرار دیا گیا ہے جو ملک دوام کی خدمت کر رہا ہے۔ جموئی طور پر جو لائی ہے ۳۲۹۱ میں ”نیرنگ خیال“ کا پہلا شمارہ متعدد جو پیسوں کا تجوہ و مرکز ہے۔ یہ شارہ حکیم یوسف حسن اور محمد بن تاشیر کی اجتماعی کوششوں کا شہر ہے۔ جنہوں نے اسے دلچسپ بنانے کے لئے مختلف علمی نوہی اور قوی معاملات و سماں پر بھی مضامن کو اس شمارے میں شامل اشاعت کیا۔ اس دور کی مسلم معاشرت، ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی حالات ادیبوں کی سوچ و فکر کا بھی شہر ہے؟ یہ نیرنگ ایک لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ”نیرنگ خیال“ مخصوص ایک ادبی جریدہ ہی نہ تھا ایک علمی تحریک کا نام بھی تھا جس نے رصغیر کے عوام میں ا؟ زادی کا جذبہ ابھارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ چالیس کی دہائی میں اردو زبان کے ایک اور مقبول عام ادبی جزیدہ ”نیادر“ بکھور کا جرأتیں میں ا؟ یا۔ اس کا پہلا شمارہ اگست ستمبر ۱۹۴۹ میں شائع ہوا۔ ادارہ تحریر میں محمد شاہین اور ممتاز شیریں کے نام شامل تھے۔ صد شاہین نے اس کا ادارہ ”فتاہیہ“ کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ مضمون کے حصے میں پہلا مضمون فیض احمد فیض کا ترقی پسند ادب ہے۔ یہ مضمون ان کے ابتدائی دور کے خیالات کا لکھن ہے اور ان کے پہلے نظری جو عوام ”میزان“ میں بھی شامل ہے۔ عبدالقدوری سروی نے ”موجودہ اردو ادب کا پس منظر“ جملہ ممتاز شیریں نے ۱۹۴۹ کے افسانے“ کے عنوان سے ۱۹۴۹ میں لکھے جانے والے افسانوں کا عده تقدیری جائزہ لیا ہے۔ یہ ان کا پہلا تقدیری مضمون ہے۔ جنگ یتیم دوم کے ناظر میں ایک اور اہم تقدیری مضمون کرشن چندر کا ”جنگ اور ہندوستانی ادب“ ہے۔ شاعری کے حصے میں غزل کے عنوان سے واحد غزل حضرت مولانا کی ہے جسے انہوں نے قسم فاقحانہ تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ حصہ شاعری میں باقی تمام نظیمیں شائع کی گئی ہیں۔ ان میں ”درستچے کے قریب“، ”ن م راشد“ اور ”میرا“ ”محروم“ ”محروم“ ”الدین“ ”شباب“، ”اہم انصاری“، ”قیامت“، ”آخر الایمان“، ”ٹپکو ا؟ وا؟“، ”ا؟ ل احمد سرور“، ”سنانا“، ”بمروح سلطان پوری“، ”کھنڈر“، ”غیب الرحمن“، ”عزم جوان“، ”محمد علی کمالی“، ”زندہ و پاسنہ درہوں“، ”خوشیدہ اللہ سلام۔ یہ خوبصورت نظیمیں چالیس کی دہائی کے شعری مظہر نامہ کو حیا کرتی ہیں۔ کہاں بیان کے عنوان سے پہلی کہاں ”ا؟ م“ سعادت حسن منشوی کے ہے۔ دوسری طبع زادکہانی محمد شاہین کی تحریر کردہ ہے

رسائل کی منفرد تحریروں کے انتخاب کا ایک گوشہ ترتیب دیا گیا ہے۔ جس میں دو مختصر تحریریں ”میں کہاں ہوں“ اور ”تاج ا؟ گرہ“ شائع کی گئی ہیں۔ ”اخبار علمیہ“ کے عنوان سے ”نیرنگ خیال“ میں ہندوستان کے اخبارات و رسائل کی منفرد و اہم تحریریوں کو بھی جلدی لئی ہے۔ پہنچی دریافت اور ایجادات سے متعلق ہیں۔ ”تین خلافت پر ایک محققانہ رائے“ کے عنوان سے؟ غامحمد صدر کا ایک مضمون بھی شامل اشاعت ہے۔ جس میں تحریک خلافت کے تاریخی کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ”عہد حاضرہ کا مغل عظم“ کے عنوان سے ایک تحریر کا اگر یہی جریدہ سے ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ جس میں سنت نہال سنگھ کی مسلم حکمران شاہ و دکن کے دولت کا ذہیر رکھنے کے باوجود کافایت شعاری سے کام لینے اور سادہ زندگی برکرنے کو بہت تقدیر بتایا ہے۔ جس کے جواب میں مدیر ”نیرنگ خیال“ نے شاہ دکن کی علم دوستی کا حوالہ دیتے ہوئے کافایت شعاری کو عین بسطابق اسلام بتایا ہے۔؟ خری صفات میں ”پارہ؟ دل“ کے عنوان سے خواجہ حسن نظامی کی ایک تحریر بھی شائع ہوئی ہے۔ جس میں مسلم معاشرت کی اصلاح کے حوالے سے مختصر تحریریں جمع کی گئی ہیں جن میں مسلمانوں کو خاص طور پر عورتوں کو ہندووں کی شادی بیاہ اور دوسری رسولوں سے اجتناب برتنے کی تلقین کی گئی ہے۔ شاعری کی ذیل میں جو مظہرات اس شمارے میں شائع ہوئی ہیں ان میں ”طوق اور زنجیر سے گھبرائیں کیا“ مولانا اختر علی خان کی تلقی ہے جو مولانا مظفر علی خان کے صاحبزادے تھے۔

شکل دیتے ہے اس کے درپر جائیں کیا
اپنے سر پتھر سے ہم مکاریں کیا
کس سے ہو گا چارہ در رفراں
اس دل پیتاب کو سمجھائیں کیا
ہو چکے جب زلف پر خم کے ایر
طوق اور زنجیر سے گھبرائیں کیا
دے کے ان کے ہات میں قسمت کی باغ
اس کے پارپنے ہم پیچتا کس کیا
کچ ادائی جس کا شیوه ہو چکا
حال دل اس شوخ کو بتائیں کیا
داغ ہائے غم پیں دل پر جا بجا
کھول کر سینہاں چیں دکھلائیں کیا
پوچھتے ہیں ہم سے وہ آخر کا حال
”کوئی بتاؤ؟ کہ ہم بتائیں کیا“ (۹)

اس کے علاوہ ”مودع“ کے نام سے محمد دین تاشیر ”برسات کی رت“ محمد حسن محمود اسرائیل ”واردات قلب“ کے عنوان سے حامد اللہ افریبی اے۔ ”ادبیات“ عزیز لکھنؤی، ”اذکار ناظم“، ابو الاظم محمد ناظم، حیات شائق، سردار اودے سگھ شائق کی خوبصورت نظیمیں شائع ہوئی ہیں۔ غزلوں میں، ٹپکی بدلائی، سہا، تاجر بجیب ا؟ بادی، اور رابعہ پہاں کی شاعری اس شمارے کی زینت ہے۔ اسلامی دنیا کی مردم شاری کے عنوان سے ا؟ خری

مشتعل تھا۔ طلوع کے نام سے اس کا اداریہ ہا جرہ مسرور نے کھا ہے۔ مضائیں، انسانے اور شاعری کا بے حد منتوں اور معیاری انتخاب اس شمارے میں شامل اشاعت ہے۔ انسانوں میں احمد ندیم قاسی کا افسانہ ”میں انسان ہوں“ اور ہاجرہ مسرور کا افسانہ ”بڑے انسان بننے پڑھے ہو“ ۲۷۸۹ کے فسادات کے ناظر میں لکھے گئے ہیں اور انہیں پر کئے گئے قلم و قسم کی المناک داستان سناتے ہیں۔ دیگر انسانوں میں کرشن چندرا کا ”بھیروں کا مندر لیڈھڑا“ اور عزیز احمد کا ”بیراد مکن میرا بھائی“ بھی لاٹ مطالعہ ہیں۔ مضائیں میں خالد حسن قادری نے ”نیا افغان“ کے عنوان سے نئے پاکستان کے احوال اور اردو زبان کو موضوع بنا یا ہے عزیز احمد نے فرحت اللہ بیگ کی مزاں نگاری پر اور غلام رسول مہمنے کمال الدین اصفہانی پر مقالات تحریر کئے ہیں۔ نقش کے پہلے شمارے میں اردو زبان کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور اس بارے میں ٹکل پا، ذاکر عبدالحق، سیماں اکبر؟ بادی۔ خواجہ احمد فاروقی اخشنام حسین، نور الحسن باقی اور خدیجہ مسٹور کے ریس خیالات اور اردو کے فروع کے لیے تجوید شائع کی گئی ہیں۔ غرلوں میں اثر لکھنی، اختر شیرانی، فراق گور کھپوری، حظیط ہوشیار پوری ملی اے۔ سردار جعفری، احمد ندیم قاسی، سیف الدین سیف، محترم صدقی کی خوبصورت غزیں شائع کی گئی ہیں۔ نظموں میں حظیط جاندہ هری، سیماں اکبر اے؟ بادی، یوسف ظفر قیمیں شفایی اور احمد ندیم قاسی کی ریاضات شائع ہوئی ہیں۔ ان صفات سے اس دور میں دونوں جانب اردو شاعری اور غزل و لظم کے مو ضعوات اور معیار کو یکجا جاسکتا ہے۔ حالات حاضرہ کے تحت ایک مضمون ہا جرہ مسرور کا ہمارا سماج کے عنوان سے شائع ہوا یہ ان عورتوں سے تعلق ہے جو فسادات میں انہوں کی گئیں۔ ان کی واپسی نے دونوں جانب بہت سے سماجی مسائل کو تمثیل کیا۔ یہ مضمون ان حالات کا تجربہ کرتا ہے۔ عبد الجبیر سالک نے مسئلہ فلسطین کے حل کے لیے کی گئی کوششوں کا احاطہ کیا ہے۔ دیگر مذکونات کے تحت قلم کے عنوان سے ڈاکو مختی ایہمیت اور افادیت برائے قدوس نے اپنے خیالات رقم کے ہیں ”دیتی تباہوں“ کے عنوان سے ہم وحشی ہیں کرشنہر کے افساوی مجموعہ پر ہاجرہ مسرور اور علی سردار جعفری کے شعری مجموعہ پر قاسی صاحب نے تبرہہ کیا ہے۔ بہ خشیت مجموعی ”نقش“ کا پہلا شمارہ خوبصورت اور یادگار تحریروں کا ایک گلداشت ہے جس کی وجہ اے؟ جبکہ مجموعوں کی جاسکتی ہے۔ ”اہ نو“ حکومت پاکستان کا سرکاری ادبی جریدہ ہے جو ہندوستانی جریدے اے؟ جکل، دہلی کی طرز پر نکالا گیا تھا۔ وقار عظیم اے؟ جکل دہلی کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ پاکستان کا پہلا دارالحکومت کا اپنی تھا۔ اس لیے اپریل ۱۸۷۹ میں ”ماہنواز“ کا پہلا شمارہ کا اپنی سے جلوہ گروا۔ معروف نقاد و نقاشیم اس کے مدیر تھے۔ اولین شمارہ ۲۶ صفات پر بنی تھا۔ ادب کے بڑے اہم نام اور ان کی تحریریں اس شمارے کی زیست تھیں۔ ”کچھ اپنی باتیں“ کے عنوان سے مدیر و نقاشیم نے اولین شمارہ کا اداریہ رقم کیا ہے۔ صفحہ ۳۰ پاچ مردم حسن قادری نے ”تاریخ قیام پاکستان“، قران مجید سے نکالی ہے۔ اس کے بعد خوبصورت اور معیاری نظموں اور غزلوں کا ایک انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ اس شمارے کی زیادہ تر تخلیقات اے؟ زادی اور فسادات کے ناظر میں کمی گئی ہیں۔ اسد ملتانی کی نظم ”غم نہ کر“، مسعود حسن کی نظم ”مدینہ

جو ”توپین“ کے نام سے شائع کی گئی ہے۔ دو غیر ملکی ترجمہ شدہ کہانیاں بھی شائع کی گئی ہیں ان میں ایک ”دہی والی“ کشڑی زبان کے ادیب ماسٹیونگ اے؟ بیکار اور دوسری ”نفرت“ ماں کیکل شاخوف کی ہے۔ نیا دور کا پہلا شمارہ ۲۳X33 کے سائز کے دو سو تین صفات پر صحیح ہے؟ خری صفات پر اس شمارے کے لکھنے والوں کا تعارف بھی شامل اشاعت ہے۔ ممتاز شیریں کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔

”عمر ایس سال مہارانی کالج بنگلور سے ۲۲۹۱ء“ ۱ میں بی اے کیا کالج میں بہت دین طالب علم تھیں۔ ادبی زندگی کی ابتداء تراجم سے ہوئی۔ میسور کی بھی ایک مسلمان خاتون ہیں جن کے تراجم اور طبعزاد انسانوں نے شامل ہند کے معیاری رسالوں میں جگہ پائی۔ ممتاز شیریں نے صرف تین طبعزاد افسانے لکھے ہیں“ (۱۱)۔

صدر شاہین ایڈیٹر و پبلیشر ”نیادر“ کے بارے میں تعارف کے حوالے سے درج ذیل معلومات شائع ہوئی ہیں۔

”پیدائش ۲۱ جون ۱۸۹۱ء“ ۱ مہاراجہ کالج میسور میں اگریزی ادب کے اے؟ نزد کے لئے بڑھا لکن بی اے کی ڈگری لئی گواٹری میڈیسٹ میں وہ اگریزی میں اول رہے تھے علی گڑھ میں ایم اے کے لئے چار پانچ ماہ ہے لیکن تعلیم کا مل کئے بغیر؟ نا۔ پا پھر لکانج پونا سے ایل میں فی کیا۔ اب ایم اے سیاسیات، معاشریات اور ایل ایم کی تیاری کر رہے ہیں اچھے مقرر ہیں۔ اردو کی نسبت اگریزی میں زیادہ لکھتے ہیں اردو میں بھی چند افسانے لکھے ہیں جو ایک مقامی رسالہ میں چھپ کر مقابل ہوئے بنگلور سے صادق صاحب کے ساتھ ایک ہفتہ وار اگریزی ”میسورین“ نکال رہے ہیں اور اب نیادر کی بھی ادارت کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی کالٹر شروع کی جائے“ (۲۱)

یہ پرچہ قیام پاکستان کے بعد ۲۵۹۱ کی تعداد کے بعد ۲۵۹۱ کی تعداد کے بعد ای نام سے ایک پرچہ کرایی سے ڈاکٹر جیل جانی بھی مرتب کرتے رہے اور لکھنؤ (انڈیا) سے اتر پردیش کے محکم اطلاعات کے تحت ایک ماہ نامہ نیا دور کے نام سے بھی شائع ہو رہا ہے۔ نقش ایک اور ایسا جریدہ ہے جس نے قیام پاکستان کے بعد اپنا سفر شروع کیا لیکن اردو کی ادبی صفات میں اپنے لیے جلد ایک اگل جگہ بنا لی۔ نقش کے تمام اشاعتی سفر کے دوران اس کے خاص نمبر ہی اس کی وجہ شہرت بنے۔ نقش کا پہلا شمارہ مارچ ۱۸۹۱ء میں حصہ شود پڑا؟ یا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسی تھے۔ ان کی ادارت میں شمارہ ایک تادی شائع ہوئے۔ قاسی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ”نقش“ کا نام انہوں نے تجویز کیا تھا (۳۱)۔ پہل شمارے کا سرور واقع؟ ذر زویٰ نے بنایا تھا۔ اس کی پیشانی پر ”زندگی؟ میز اور زندگی؟“ موز از ادب کا ترجمان“ کے الفاظ بھی قاسی صاحب کے خلاف ذہن کی انتہاء تھے۔ محمد طفیل (۱۸۹۱-۳۲۹۱) جو نقش کی بدولت محمد نقش بن گئے تھے۔ انہوں نے ۲۲۹۱ء میں لاہور میں ادارہ فراغ اردو کی بنیاد کی تھی ”نقش“ کا اجراء۔ اس کے تحت کیا گیا تھا۔ ”نقش“ نے کئی مزرك؟ الا؟ رانبر شائع کے اور اپنے پیشہ و جرائد ”نکال“ اور ”نیگنگ خیال“ کی روایت کو؟ گے بڑھا لی۔ نقش کا پہلا شمارہ ۲۸ صفات پر

طرح تخلیق کرتی ہے لیکن وہ ا؟ سان کی اہمیت کو مجھی نظر انداز نہیں کرے گا کہ ا؟ سان اس تخلیق میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے مگر؟ سان کی اہمیت ہر حال ٹانوی ہے اور یہ کہتہ ہے وقت ہماری نظرور کے سامنے ہے“ (۵۱)

ا؟ غاز میں ”ہمارا طفل“ کے عنوان سے ظمین اور افسانے شائع کئے گئے ہیں۔ پہلی نظم ”پاہی“ کے عنوان سے مجید احمد کی ہے مگر شعرا میں قیوم نظر، شہزاد احمد، رشید قصراںی وزیر ا؟ غا، جعفر طاہر، عارف عبد النبی کی نظیں شائع کی ہیں۔ ای گوشہ مولانا صلاح الدین احمدی یاد میں مجھی مخصوص کیا گیا ہے جس میں ا؟ غامحمد باقر، انور سدید اور وزیر ا؟ غا کے مولانا ۲۶۷

صلاح الدین احمد کے فن و شخصیت پر مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ ”سوال چھپے“ کے عنوان سے ایک مسلسل انشاء اور قائم رہا۔ جس میں کسی ایک موضوع پر مختلف ادیبوں کی ا؟ راشائح کی جاتی رہیں۔ پہلے شمارے میں ”فن ابلاغ کی اہمیت پر شہزاد احمد، سجاد باقر رضوی، غلام جیلانی اصغر، صدیق گلیم اور صلاح الدین نعیم کی رائے شامل اشاعت ہے۔ (۶۱) پہلے شمارے میں تم اہم ادبی اصناف پر بہترین معیاری انتخاب شائع کیا گیا ہے اور سائنس کی دھانی کے تمام اہم ادبیوں کی بغیر کی ادبی گروہ بندی کے نام اور تخلیقات اس شمارے میں جلوہ کر ہیں۔ اور اس کی ادبی خدمات کا دائرہ تقریباً ستر شاروں پر محیط ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان عظیم ادبی جرائد کے اشاریے مرتبت کرائے جائیں تاکہ ان میں موجود عظیم ادب پاروں کا نتیجہ نسل اور تخلیقیں کو اندازہ ہو سکے اور وہ اس سے استفادہ کر سکیں۔

حوالہ حوشی

- (۱) اولی دنیا، لاہور، نوروز نمبر، ۲۳۹۱، جلد نمبر ۷، شمارہ نمبر، ۸۹
- (۲) ڈاکٹر طیق احمد نے لکھا ہے کہ ”گاہر کا اجر ا؟“ کہہ سے ہوا اور پہلا جریدہ فروری ۲۲ ۲۲۹۱ کو شائع ہوا، صفحہ ۲۸ ماه نامہ انشا گلکٹن نمبر ۱۹۹۰: یا ز پھری ببر، ماںک ٹالہ نے صفحہ ۸۲۱ پر یہی بات درہائی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب ”پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ“ مطبوعہ ۲۹۹۱ میں صفحہ ۱۱ اے پر لکھا ہے۔ ”بھوپال سے فروری ۲۲۹۱ میں ٹکار جاری ہوا۔“ رسائل کے ابتدائی صفات میں ایسا کچھ نہیں پر نہ ہوا کہ یہ پر کہاں سے شائع ہو رہا ہے۔ صفحہ ۳۵۰ پر لکھا ہے ایڈیٹر سے خط و کتابت کا پتہ۔ نوٹ چل بھاپال ہے۔ امکان غالب ہے کہ نیاز پوری بھوپال میں قیم تھے اور پر چڑا؟ گہرے سے جاری کیا گیا۔
- (۳) اردو جام انسانکو بیدیا (جلد دوم) مطبوعہ شیخ شalam علی ایڈن سائز لاہور ۸۸۹۱ نے صفحہ ۱۹۱ پر لکھا کے نیز گل خیال لاہور ۲۲۹۱ میں نکلا جو کہ مخطوط ہے۔
- (۴) محمد طفیل، حکیم صاحب (خاکہ) مطبوعہ، نقوش، لاہور، محمد طفیل نمبر، (جلد دوم) شمارہ ۵، ۵۳۱، جولائی ۱۹۸۱، ص ۱۷۰
- (۵) برنی، سید مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم، اردو اکادمی دہلی، ۲۳۹۹۱، ص ۲۳۵
- (۶) حکیم یوسف حسن کی وفات پر شان امن حقی نے تاریخ وفات کی ہے۔ اٹھ گیا بانی میخانہ نیز گل خیال بچ دو دعا عرصہ نیز گل خیال ۱۰۰۲۱ھ بکوالہ۔ سہ ماہی

ا؟ دم“ شرحی کی نظم ”محسوسات“ اور شواعر عادل کی نظم ”میند سے پہلے“ کے بنیادی استعارے اور نظمیات غم، بے نی اور اس سے جنم پینے والی یادیت ہے جبکہ احمد ندیم قاسی کی نظم ”کل اور ارج“ ان کے ترقی پسندان نظریات کی علمبردار ہے۔ اس شمارے کی واحد غزل فراق گور کو کوئی کوئی ہے جو غزل کے روایتی مو ضوع کی حامل ہے اور اس میں کوئی نیا پنچ نہیں ہے۔ افسانوں میں کرشن چدر کا ”لال باغ“؟ ا؟ غامحمد کا اشرف کا ”دل کا ایک پودہ“ خواجہ احمد عباس کا افسانہ ”میں کون ہوں“ فسادات کے موضوع پر ہیں۔ اس شمارے کے قابل مطالعہ اور اہم مضامین میں خواجہ غلام السین کا مضمون؟ ا؟ ندی میں چاگ“ توی ترقی کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ علی سردار جعفری کا مضمون ”اقبال کی ا؟ دواز“ اقبال کی شاعری میں حرکت و عمل کے پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ سید احتشم سین نے ”اردو کا سالانی مطالعہ“ میں زبان کے مطالعہ کے لئے صوتیات اور لسانیات کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کا مضمون ”پاکستان کے بعض تقاضی مسائل“ اس میں نو راستہ ملک میں تعلیم کی حالت زدار مستقبل کے تعقیب مخصوص بولوں پر سوچ بخار شامل ہے۔ جس کا ایک پر اراف حکومتوں کے طرزِ عمل اور سوچ و گلکی عکاہی کرتا ہے۔ جس کا تسلسل ا؟ رجھی جاری ہے۔ اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

”لایم کے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ اس پر فراہمہ کے روپے صرف کرنا اگر غضول خرچی نہیں تو زکوا؟ یا خیرات کے قسم کی کوئی چیز ہے جس کا حاصل مادی اعتبار سے پچھنچیں“ (۶۲)

”اٹاڑک کی وصیت؟“ ا؟ غامحمد یعقوب دوائی کا مضمون ہے جس میں اٹاڑک کی ایک تقریکاً اقتباس دیا گیا ہے جو پارٹی کی ایک کانگریسیں میں چھوڑنے جاری رہی ہی دیکھ مضمومین میں سید وقار علیم نے شاہ عبداللطیف بھٹانی کا تعارف اور فعل حق قریشی دہلوی نے مغلوں کے فن خطاطی پر ایک ایک لچپ اور معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے۔ صفحہ ۵ پر دوئی اردو فلموں اور دنی تابوں کے عنوان سے علی سردار جعفری کی نظموں کے مجموعے ”تی دیما کوسلام“ اور اوپنہ ناتھ اٹک کے ڈراموں کے مجموعہ ”ازلی راستے“ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ جی ہے کے وسط میں قیام پاکستان سے متعلق کئی اہم تصادی بھی شائع کی گئی ہیں۔ ماہ نو کا اشتاقت سفر ا؟ رجھی جاری ہے۔ اب یہ لاہور سے شائع ہوتا ہے اور علی دبی حلقوں میں ایک محترم ادبی جریدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے سیکنڈوں صفات پر پاکستانی ادب کے عظیم جواہر پارے اور ادب کی تاریخ بھی بہت ہیں۔ اور اتنی کا بہلا شمارہ ۵۲۹۱ میں ڈاکٹر وزیر ا؟ غا کی زیر ادارت لاہور سے ماہ وار جریدے کی صورت شائع ہوا۔ اس پر کسی مہینہ کا اندرانیج نہیں ہے یہ ۲۱۳ صفات پر مشتمل ہے۔ اس کی قیمت دو روپے ہے۔ فہرست میں مختلف اصناف کے لئے عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ پہلا درج کے عنوان سے ڈاکٹر وزیر ا؟ غا نے ادارے میں لکھا ہے۔

”اور اس کے پس پشت بنیادی ادبی نظریہ بھی ہے ہم سمجھتے ہیں کہ کسی ملک کے ادب کو اس کی ثافت اور تہذیب سے الگ نہیں لیا جا سکتا اور ثابتی ماحول زمین کی بآس، پانی، ہنک اور رضاہر عصر ا؟ قاتی کے گل سے پیدا ہوتا ہے اور اس زمین کو اہمیت دیتے ہیں اس لئے پیش پیش رہے گا کہ زمین عورت کی

قوی کوںل برائے فروغ اردو زبان کے رسائل
سہ ماہی فکر و تحقیق
ماہنامہ اردو دنیا
ماہنامہ خواتین کی دنیا
ماہنامہ بچوں کی دنیا
یہ سمجھی رسائل دیدہ زیب بھی ہیں اور لائق مطالعہ بھی۔

Sale-cum-Exhibition Centre
West Block - 8, Wing - 7, R. K. Puram,
New Delhi - 110066
Telephone : (+91 - 11) 26109746, 26108159
email: sales@ncpul.in,
ncpulsaleunit@gmail.com

☆☆

میر آٹھویں کھصو کے معزز تعلیم پڑھتے گھرانے سے ہے۔ شادی کے بعد
امریکہ آگئی۔ میں اردو، ہندی اور انگلش میں حصی ہوں۔
میری شاعری کا مجموعہ ”رعنایاں درد کی“ بن کر خودار ہوا ہے۔ حق پوچھا جائے تو
شاعری کا اصلی رنگ درد ہی میں چھا ہوتا ہے جیسا کہ انگریزی شاعر قیلی نے کہا
ہے ”ہمارے نئی نئی خیالات ہی شیریں نخے لاتے ہیں۔“

رعنایاں درد کی

شعری مجموعہ

عثمانہ اختر جمال

۳۰۰ روپے

\$15.00

Email: usmanajamal15@gmail.com

ناشر: عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی
9971775969

سبق اردو

- اردو کراچی جلد ۱۲، شمارہ نمبر ۳، ۵۸۹۱، جولائی ۲۰۲۳ء
(۷) نیونگ خیال، ماہ نامہ، لاہور، جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۱، جولائی ۲۰۲۱ء، ص
- (۸) ایضاً ص ۷۶
(۹) ایضاً ص ۸۳
(۱۰) ایضاً ص ۷۷
(۱۱) نیاور، سہ ماہی، پنگلور، جلد اشمارہ نمبر ۱، جولائی ۲۰۲۰ء
(۱۲) ایضاً ص ۳۰۲
(۱۳) بحوالہ نقش، محمد طفیل نمبر (جلد نمبر ۱)، جولائی ۲۰۲۱ء
(۱۴) رائے پوری، اختر حسین، ماہ نو، کراچی، جلد اشمارہ نمبر ۱، اپریل ۲۰۲۱ء، ص ۸۲
(۱۵) اوراق، ماہ نامہ، لاہور، جلد نمبر اشمارہ نمبر ۱، ۵۶۹۱، جولائی ۲۰۲۰ء
(۱۶) سوال یہ ہے، جو ”اوراق“ کا مقبول سلسلہ تھا۔ اس کے تمام مباحث کو تابی
صورت میں جمع کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔ ●●

گیان چند کمپنیو نشر دہلوی کا پہلا انسانوں کا مجموعہ

درد کے سائے

صفحات

۱۹۲

قیمت

۳۰۰ روپے

سنه اشاعت

۲۰۱۹ء

شمول احمد کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر پرویز شہریار

جنی۔ وجہی تھی کہ اس نے خلوت میں جنی عمل کے پس مظاہر میں بیوی کو ماں سے تشریف دے دی تھی۔ ایسا کر کے وہ ظہار جیسے گناہ کا مرتكب ہو گیا تھا اور اس کے بعد وہ کفارہ ادا کیے بغیر بیوی سے جنسی تعلقات کے لیے رجوع نہیں کر سکتا تھا۔

شہر قاضی نے اس کے لیے مشورہ دیا تھا کہ—
”شوہر کو چاہیے کہ ایک غلام آزاد کرے یادو مہ مسلسل روزہ رکھے یا سائٹھ مسکینوں کو دو وقت کھانا کھالے۔“

نجہ کے دوسارے بعد بھی جب پچ تو ایک دن ہوا تو اس نے مشورہ دیا کہ وہ چیزیں جی کے اس لئے پچ نہیں جن کھتی ہے۔ نجہ کے شوہر کو لگتا ہے کہ ماں اس کی دوسری شادی نہ کر دے کیونکہ وہ نجہ سے اپنی خانہ کرتا کے حالات کے دباؤ میں وہ غیر فطری جنسی پیش رفت کر پڑھتا ہے۔ نجہ ایک مودون کی بیٹی، مذہبی خیالات کی لڑکی تھی وہ اسے گناہ حسم کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کفارہ کے طور پر کہانی کا ہے وہ جو کہ پچھلے کے اعتبار سے کتاب ہے وہ مجاہدہ کی ٹھان لیتا ہے۔ وہ دو ماہ کے مسئلہ روزے رکھتا ہے اس کے بعد جب نجہ کی محبت میں جب اسے جنسی حاجت محسوس ہوتی ہے تو وہ وضو بنا کر نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے اور خود پر لعنت بھیجا ہے:

”تفہے مجھ پر کپیشاپ داں سے پیشاپ داں کا سفر کرو۔.....“
اس کہانی کا اصل موضوع ملکی خواہشات کے ذریعے جملی خواہشات پر قابو ہے۔ بے شک یہ عارضی کیفیت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عورت اور مرد کے فطری خواہشات کے لئے ہو سکتے ہوں جسے کوئی ملکوتی سے دیا جاسکتا ہے۔ اخلاقی اور مذہبی اصول و ضوابط کے تحت قابو میں کیا جاسکتا ہے؟
شمول کا اپنا اسلوب یہاں اس افسانے میں بھی جملہ افزوں سے وہ عورت اور مرد کے خلوت کی جزیات اپنے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ جس کہانی کا ہیرا پنی غیر فطری پیش رفت پرستاف کر رہا ہوتا ہے تو اس کی جزیات دیکھئے:
”نجہ اسی طرح سوچی گئی..... وہ اس کے درخواست کو موتا تھا۔ آخر کیا کہ جنی سوچی کو بھانے لگے اور اس نے ا沃اطت کو راہ دی۔.....؟ اس پر شیطان غالب ہوا۔ اس کو مجرمت ہوئی کہ کس طرح وہ اپنا ہوش کو بیٹھا تھا۔.....؟ اس نے نجہ کے ساتھ زیادتی کی۔ وہ ڈرگی تھی۔ ہر عورت ڈر جائے گی..... نجہ تو پھر بھی مقصوم ہے۔ نیک اور پاک صاف بی بی۔..... جیسے خانے ایک ناجابر کی جھوٹی میں ڈال دیا۔“

اس افسانے میں نہ امارہ کی کرشمہ زایوں سے لڑنے کے لیے گرگی کو تھیا رتایا گیا ہے۔ گناہوں سے توبہ، معافی عبارت، روزہ، اپنے نہیں سے جاہدہ، دنیاوی لذتوں سے اجتناب کے ذریعے خباثت پر قابو پایا جاسکتا ہے بشرطیکہ یہ سبی اعمال

شمول احمد کی پچان ان کے مشہور افسانہ ”سگھار داں“ سے قائم ہوتی ہے، لیکن خود شمول احمد کو ”عجائب“ میں شامل افسانہ ”ظہار“ بہت پسند ہے۔ بہر حال، ”ظہار“ اگر شمول کا سب سے پسندیدہ افسانہ ہے تو ”سگھار داں“ کی بھی اپنی انفرادی شان ہے۔

شمول احمد نے اس افسانے میں جس طرح ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی سائیکی پر سوار فسادات کے مفتراءٹ کے آسیب کو بوقت میں قید کیا ہے۔ اس کمال اُن تک بال بعد جدیدیت کے اچھے سے اچھے افسانہ نگاری کی سائیکی میں بھی کہتے ہیں کہ آٹھویں دہائی کے بعد افسانہ نگاری کے نام پر زیادہ تر روپر ٹک ہوئی ہے۔ اپنے ناقدرین ادب سے میری مودبانہ گزارش ہے کہ وہ ایسے قلب کو بے میمان کر دینے والے احساسات اور روح کو فکار کر دینے والے کثیلے واقعات برتنی شمول کے افسانے کی قرات سے خوکر کم از کم ایک بار ضرور گزاریں اور، یہیں کہ اس افسانے میں موجود آتشیں شعلوں سے وہ کس حد تک اپنا دامن پھاپاتے ہیں۔ لغتہر، یہ افسانہ شمول احمد کا مجرہ ہے اُن شہر اہے۔

شمول نے ایسے ایسے موضوعات پر افسانے لکھے ہیں جن پر میں سمجھتا ہوں کوئی بھی میٹی یا خاہ وہ پرنٹ میٹی یا یا لیکٹر ایک میڈیا پر پورٹنگ کیں کر سکتا ہے۔ ادب اگر تہذیبی و ستاویز ہے تو شمول کے افسانے اپنی تمام تر جمالیاتی قدوں کے ساتھ فکاران قابوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے اسلوب کی انفرادیت کے ساتھ ادنی و ستاویز قرار دیجے جاسکتے ہیں۔

فدادات میں کاشت و خون، آتش زنی اور لوث مارعام بات سمجھی جاتی ہے۔ جس کا نوح قریب قریب سمجھی افسانہ ٹکاروں نے لکھا ہے۔ جانی اور مالی زیاد کا حساب بہتوں نے پیش کیا ہے۔ دل و دماغ کے رُشی ہونے اور فوری رد عمل کی صورت میں نفیانی طور پر اعضا رے ریسیس کے مفلوون ہونے کے واقعات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ لیکن سگھار داں کے قیدی کردار بر جوہن اور اس کی تین جوان بیٹیوں اور بیوی کا قلب مایبیت ہو جانا اور اپنے تمام ہوش و حواس کے ساتھ رہنڈیوں اور دلال میں تبدیل ہو جانا، اپنے آپ میں ایک ایسا عجیب و غریب واقعہ ہے جو کہیں نہ ہیں ہندوستانی مسلمانوں کی متاثرہ سائیکی کو چھو جاتا ہے۔ سبی افسانے کے موضوع اور اس کے فریض منٹ کی غیر معمولی کامیابی کا راز ہے۔

ای طرح، ان کا افسانہ ”ظہار“ ظہار ایک مذہبی معاشرت سے تعلق رکھنے والا افسانہ ہے۔ لیکن جس طرح سے شمول نے اس موضوع کو افسانہ کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کہانی کے ہیرا پر اس کی بیوی نجہ حرام ہوئی

سے اپنی ازدواجی زندگی کے حظکے سمجھوتا کر لیتا ہے۔
 ”راشدہ آہستہ سے عثمان کے کافنوں میں پھنسا۔“ ابی جب تک الطاف بھائی دوسرے کمرے میں آرام کر لیں تو کوئی حرخ نہیں۔
 عثمان اس وقت بھلکی کھارہ تھا۔ اس کو لگا کا ناحل میں پھنس رہا ہے۔.....
 عثمان نے سادہ چاول کا فونال بنا دیا اور چاول کے ساتھ کافن بھل گیا۔
 شموکل احمد نے اپنے انسانے ”سراب“ میں سماجیاتی تقاضات کا منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ترقی یافتہ مسلم معاشرہ اور دینی نویں Ghattoں معاشرے کے تقاضوں کو بہت ہی موثر اور دلچسپ ڈھنک سے اپنے منفرد اسلوب کے ساتھ بیٹھیں کیا۔
 اس میں دلکھایا کیا ہے کہ کسی اسکول کے ایک ماسٹر خلیل کا طاعت گزار پیٹا بدرا الدین جیلانی آئی ایس آفسر ہو جاتا ہے اور باب کی انا سے کامیابی کی منظہ پر دیکھنا چاہتی ہے۔ اس پکر میں اس کی شادی کی گشتوں رجم صمدانی کی بیٹی عاطفہ حسین سے کرداری جاتی ہے۔ لیکن عاطفہ کی پروشن اپنی سوسائٹی میں ہوئی ہے اس لیے مسلم گھبڑا ایڑھے میں وہ رہنا پسند نہیں کرتی ہے۔ یہ لوگ آئی اے ایں کا لوگوں میں آباد ہو جاتے ہیں۔ لیکن تمام عمر جیلانی پلٹ کر اپنے محلے اور اپنے بیٹھنے کے دوست حیات اور معنوں کو حسن بانو کی طرف دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ وقت کی کو معاف نہیں کرتا۔ عاطفہ حسین کی موت ہو جاتی ہے۔ اپنی پہلی فرصت میں جیلانی اپنے آبائی محلے میں واپس آتے ہے جہاں اس کے بچپن اور جوانی کے شب و روزگار تھے۔ لیکن تہ بہت بہت پھر بدل چکا تھا۔ محلہ شہر نما ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی استانی کی بیٹی حسن بانو سے اس کی اتفاقی طلاقات ہو جاتی ہے۔ جس کے بالوں میں عمر سیدیگی کی وجہ سے چاندنی گھل بیٹھی ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو حضرت بھری ٹھاکوں سے دیکھتے ہیں۔ جیلانی کے دل میں ایک ہوکی اچھتی ہے۔ دوسرے دن وہ شہر چلا آتا ہے۔ لیکن شہر آتے ہی اس کے بچپن کے دوست حیات کا فون آتا ہے کہ حسن بانو اس جہاں میں نہیں رہی۔ جیسے وہ جیلانی کی ایک بھلک دیکھنے کے لیے ہی اب تک زندہ ہی اور دیدار کے بعد اس کی روشن قفسی عضری سے پرواز کر جاتی ہے۔
 اس درد بھری کہانی میں شموکل کے فن نے دل کو چھوپ لیا ہے۔ ہر چند کے شوکن کافن موڑان آرٹ کی طرح بہت فحیصل بیان نہیں کرتا ہے پھر بھی ان کے مولے قلم کی جنبش سے جو چند آڑی ترچھی لکیریں چینی ہیں ان میں انھوں نے درداشتیں دیا ہے۔ مسلم معاشرے کی خامبوں کو اجاگر کیا ہے۔ فی الحال اسے دیکھا جائے تو اس میں وحدت تاثر اپنی بگہ موجود ہے۔ لیکن وہ واقعات کے بیان میں بیدی کی طرح چول سے چول نہیں کہتے بلکہ منوکی طرح لفظوں کا بڑی کافیت شعاری سے استعمال کرتے ہیں۔ اختصار ہی ان کے افسانوں کا امتیازی وصف ہے۔ البتہ بیان میں راوی کہیں نہیں ہوتا بلکہ پس پر دو واقعات بیان کرتا جاتا ہے۔ تیج تیج میں حکایت کی طرح پڑو نصیحت کی سطریں بھی آجاتی ہیں۔ حس سے قصہ کی تفہیم اور رفتار میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔
 ”انسانی رشتہوں میں ان کی میل جڑی ہوتی ہے۔ سب میں بھاری ہوتی ہے باپ کی انا..... اضافہ ہوتا ہے مثلا۔

”چے دل سے کیے جائیں۔“
 ”اس کو پہلی بار احساس ہوا کہ عبادت کا بھی اپنا سرور ہے۔ والپی میں قاضی سے ملاقات ہوئی قاضی اس کو کیہ کر مسکرا دیا۔“ ”مسجدیں آتے ہو میاں؟“
 جواب میں وہ بھی سکر لایا۔
 ”جہنم کی ایک وادی ہے جس سے خود جہنم سوار پناہ مانگتی ہے اور اس میں وہ علاما دل ہوں گے جن کے اعمال دکھاوے کے ہیں۔“
 ”مصر کی ڈلی“ بھی تو پیتا جوڑے راشدہ اور عثمان کی ازدواجی زندگی سے جنسی کشش اور مدافعت کی کہانی ہے۔ ایسے باریک احساس کی کہانی ہے جہاں ایک شریف نوجوان عثمان اپنی بیوی راشدہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اور اس کی خوشی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے درپر ہتا ہے لیکن اس کے جنسی رویوں تھے والا کردینے والی وہ عورت نہیں ہے اس کی بیوی راشدہ جس کی متنقی ہے۔ راشدہ جنسی اخبار سے گرم اور پہل کرنے والی جوان عورت ہے تاہم راشد کی طرف سے وہ اپاہن پن کی اسے اپنے گھر کے سامنے آئے نے پڑوی الطاف کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔ یہ دو قلب اس دیکھیں:
 ”عثمان کے ہاتھ کھردے ہوں گے لیکن اس کی گرفت بہت زخم تھی..... وہ بھجھوڑتا نہیں تھا..... وہ راشدہ کو اس طرح چھوٹا جیسے کوئی اندر ہیرے میں بستر ٹوٹا ہے.....!“
 ”بھنی بھل کے دوران کوئی شیشہ دیکھے گا تو کیا دیکھے گا.....؟ جبلت، اپنی خیال کے ساتھ موجود ہو گی۔ لیکن عثمان کے ساتھ ایسا نہیں تھا..... وہ اس کے لب و رخار کو اس طرح سہلاتا جیسے عورتیں رومال سے پھرے کا پاؤ ڈر پوچھتی ہیں!“
 عثمان کا نیا پڑوی الطاف کسی نہ کسی بہانے سے ان کی ازدواجی زندگی میں آڑے آتا ہے اور عثمان کے دل ودماغ میں شہر بڑنے لگتی ہے، اس افسانے کے کردار اور واقعات کو شموکل نے ستاروں کی خصلت کے پیراءے میں بیان کیا ہے۔ عثمان کا ستارہ مٹکل ہے لیکن الطاف تھی ہے۔ شنی چرچٹ ہے، وہ بھچانیں چھوڑتا۔ شنی دکھ کا استغفار ہوتا ہے اور مٹکل خطرے کی علامت ہے کہتے ہیں کہ شنی اور مٹکل کا جوگ اچھا نہیں ہوتا۔ چوتھے خانے میں ہوتے گھر بر باد کر دے گا اور دسویں خانے میں ہوتے ہندہ چوپٹ کرے گا۔
 راشدہ بہت پیار دینے والی عورت تھی۔ اس لیے عثمان کو الطاف سے زیادہ اپنی بیوی راشدہ سے خطرہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ جب بھی عثمان الطاف کی چوری پکڑ لیتا ہے راشدہ اس کا حق بچا دکرنے لگتی ہے۔
 الطاف عثمانی کے غیر موجودگی میں موقع دیکھ کر راشدہ کی قربت حاصل کر لیتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ کھل کھلنے لگتے ہیں الطاف کی نوازشیں جاری رہتی ہیں۔ بھی بھلی، بھی بامستی چاول کی ٹھنی تیل مصالحہ بھی سبزیاں مٹھانی کے ڈبے وغیرہ وہ تھے تھا۔ تھا۔ تھا۔
 شنی کی ایک خوبی اور ہے شنی جس کا دوست ہو جائے، اسے اپنی نوازشوں سے لاد دیتا ہے۔ شموکل نے اس پہلوک مصری کی ڈلی میں علاما ہوتا ہو دکھایا ہے۔
 آخر میں عثمان اس مداخلت بے جا کا اس تدریج عادی ہو جاتا ہے کہ اسے ایک طرح

کے بجائے سیکنڈ سے جسٹی کا ووٹ کی خواہش لیے سیدھے سیکنڈ کے گھر پہنچتے ہیں۔ لیکن میں وقت پر سیکنڈ کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے اور وہ مولانا سے امامت سے استفیٰ دینے کی صد پڑائی ہے۔ وہ کہتی ہے میں تو بری ہوں، لوگ مجھے برائجتے ہیں لیکن آپ امام ہیں۔ قوم آپ کے پیچے نماز پڑھتی ہے۔ آپ کو حیثیت امام یہ سب کرتیں زیب نہیں دیتی ہیں۔ مولانا ایک فاختہ کی تعبیر برداشت نہیں کر سکتے ہیں وہ ایک دم چاراغ پا ہو جاتے ہیں۔ مولانا یکلٹت محسوں ہوتا ہے۔ سیکنڈ بھی زوجہ کی طرح ٹھس ہے سیکنڈ بھی ہے۔

”بھلا آپ جیسا آدمی جنازے کی نماز پڑھائے؟.....“

”قوم ہر جگہ رسوایہ ہو رہی ہے تو اس کی وجہ بھی ہے کہ آپ جیسے لوگ امامت کر رہے ہیں۔ زندگی میں اگر صحیح نہیں فی تو تم ازم مرنے کے بعد تو نصیب ہو.....“

مولانا برکت اللہ اس فاختہ عورت نے نظر چانے لگتے ہیں۔ وہ ہر وقت ان سے امامت سے استفیٰ دینے کی سعیت کرتی رہتی ہے۔ لیکن جب سیکنڈ اکشاف کرتی ہے کہ وہ پیٹ سے ہے اور بیٹھا ہوا تو دیوبند میں پڑھائے گی اور عالم فاضل بنائے گی۔ تو یہ سنت ہی مولانا کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سیکنڈ ضدی ہے اگر وہ کہہ رہی ہے تو یہ کام بھی نذرت اللہ واری ضرور رکھے گی۔

وہ اس فاختہ کے لئے میں پڑھے والے امام کے وجود کے تصور سے کاپ جاتے ہیں۔ مولانا کو محسوں ہوتا ہے کہ سیکنڈ کی تم داریت دراصل جاریت کی غارہ ہے۔ آگے کی طرف لکھا ہوا سینہ..... تلوار کی طرح لمبائے ہوئے بازو عقاب جیسی آنکھیں..... ایسی عورتیں آسانی سے پر نہیں ڈالتیں ہیں۔ مولانا کوas وقت لوگ لاج ستانے لگتا ہے اور شہوت کا بہوت سر سے غائب ہو جاتا ہے۔

”مولانا کو خاموش دیکھ کر سیکنڈ کی آنکھوں میں نفرت کی چمک بڑھ گئی۔“ ”ایمان کی خناکت ضروری ہے۔“ پھر اس نے سر سے پاہن تک آگ برساتی نظر وہ سے دیکھا اور اجھائی خوات سے بولی۔

”آپ جیسا امام.....؟ اوہم.....!“ اور کمر سے نکل گئی..... کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے فرش پر تھوکا نہیں تھا لیکن مولانا کو کہ حرام نے باہر نکل گئی۔

مولانا برکت اللہ اپنی بچک برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ جیسے ہی سفلی جذبہ شہوت کا عمل دخل کمزور پڑتا ہے اسی وقت بدلت اور انتقام جیسے سفلی جذبے اس خلا کو پر دیتے ہیں۔ انسان کے اندر موجود ہوں کی آگ اب انتقام کی آگ میں بدلت جاتی ہے۔ جویں وہ اس راز کو بھیشہ کے لیے دفن کر دیئے کام منصوبہ بنا لیتے ہیں اور موقع ملنے والی وصال کے لحاظ میں نکلیے سے منہد بکارے سے بھیشہ کے کی موت کی نیزدگی سلا دیتے ہیں۔

”سیکنڈ کی آزاد حق میں گھٹ کر رہ گئی..... آنکھیں اُنل پڑیں..... زبان اشیخگی ناک اور منہ سے خون امل کر یکی پچھلی گیا۔“

شیکنڈ احمد کا ”اوٹ“ معاشر کے دو ہرے معیار زندگی اور Doxa کے تحت اپنی سماجی حیثیت منوانے والے مرد اس معاشرے پر ایک زبردست طفر ہے جس

باپ کا روں اکثر ویلین کا بھی ہوتا ہے۔“

ذہبی ریا کاری، جس اور جرام کے موضوعات پر بے شمار افسانے لکھے گئے ہیں لیکن شیکنڈ احمد کا افسانہ ”اوٹ“ اس سکل کے گئے تمام افسانوں سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ شیکنڈ نے یہاں مخفی قدر رہوں کی حامل سیکنڈ کے اندر موجود شہوت قدر رہوں کو مظہر عالم کی کوشش کی ہے۔ انسان اور سکنڈ میں فرق ہوتا ہے۔ کھوٹا سکنڈ دونوں طرف سے کھوٹا ہوتا ہے لیکن انسان کا اگر ایک پہلو برہے تو دوسرا پہلو بھی برہا ہو کی ضروری نہیں ہے بلکہ دوسرا پہلو اچھا بھی ہو سکتا۔ اس کہانی کی مرکزی کردار سیکنڈ ایک حرافہ اور فاختہ عورت ہے جس کے شوہر کا کوئی پتہ نہیں اور وہ اپنے دو بچوں سمیت رحمت علی کے جواری میں ہشمت علی کے لگے پڑ جاتی ہے۔

محلے والے اسے ہشمت علی کی رکھیں جلاتے ہیں۔

ذہبی ریا کاری کے نہادہ کروار مولانا برکت اللہ وارثی میں جو مسجد کے امام ہیں دوسری طرف تو ہم برہتی اور اندر جی عقیدت کے شکار رحمت علی کا کروار ہے جن کا خیال ہے کہ ان کے کمر پر کسی نے سحر کر دیا ہے جس سے ان کے گھر کی برکت جانی رہی ہے اور اکلوتا ہیٹا جواری نکل گیا ہے جو کہیں سے دو بچوں کی ماں سیکنڈ کو اٹھالا یا ہے۔ مولانا کی آمد و فوت دعا توبید کے بہانے گھر تک شروع ہو جاتی ہے اور سیکنڈ سے ان کے چندی تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ لیکن سیکنڈ کے اندر موجود شہوت قدر رہیں کروٹیں بدلتے ہیں اور وہ مولانا کے ساتھ اس کے ناجائز رشتے پر انکی اٹھانا شروع کر دیتی ہے۔ جس کا انجام اسے اپنی موت کو گلے لگا کر جھکھٹا پڑتا ہے۔

افسانے کے ابتدائی چند جملوں میں شیکنڈ نے اشارہ کر دیا ہے کہ یہ افسانہ سانحکات Events کا افسانہ ہے جہاں ایک عجیب و غریب صورت حال نے

تمم لیا ہے اور اس کے کروار نہ ہب جس اور احساس جنم کی دلال میں گھرے ہوئے ہوئے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھیں:

”مولانا برکت اللہ وارثی کا اوٹ سرکش اور سیکنڈ رسی یانٹی تھی۔ مولانا نادم نہیں تھے کہ ایک ناخم سے ان کا رشتہ اوٹ اور اسی کا ہے، لیکن وہ مسجد کے امام ہیں تھے اور سب اس ان لاکڑھاس گناہ میں جھٹا کر تھی۔“

دراصل، سیکنڈ فرانٹ نے جس کی جبلت کو سب سے بڑا حکم بتایا ہے۔

یہاں مولانا برکت اللہ وارثی جیسا عالم جیسے فس پر قابو اور بسط کرنے کی تعلیم و تربیت حاصل ہے وہ بھی اس کی بھوک سے ترپ احتراہ ہے اور اپنی کی نسبت ایک فاختہ کے اندر زیادہ شہوانی کشش محسوس کرنا ہے اور اس پر اپنی جان چھڑ کنے لگتا ہے۔ اس کی نار برداری کرتا ہے اور اس کی ہر فرمانشیں پوری کرتا ہے تو اس کی

جب یہ ہے کہ سیکنڈ نہیں خردی تھی..... وہ بھی سونے کی..... زوجہ نہیں

”زندگی میں بھی نہیں خردی تھی..... وہ بھی سونے کی.....“ پہنچتی تھی، وہ بیلاق پہنچتی تھی ناک کے پیچوں تھی چاندی کی بیلاق..... وہ خفاہی تھی۔ بیسرا آتی تو دھائے مسنون پڑھتی اور مولانا نے محسوس کیا تھا کہ سیکنڈ میں جست ہے اور زوجہ ٹھس ہے۔“

لیکن فرماںوں نے جب تھمہانہ انداز اختیار کر لیا تو مولانا سے پانی اوپر ہوتا ہوا محسوں ہونے لگتا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ مولانا نماز جنازہ پڑھا کر اپنے گھر جانے

مرگ انبوہ

ناول

مشرف عالم ذوقی

تیسراں آنکھ

(شعری مجموعہ)

ڈاکٹر شریف احمد قریشی

7078709977

مدد
ڈاکٹر منصور خوشنتر

9234772764

سبق اردو

44

میں تجھی اور ترشی دلوں گھلی ہوئی ہے۔ شموکل نے سماجی حاشیہ پر زندگی برکرنے والی ایک حرافہ اور فااحشہ عورت کے ذریعے سماج کے مقدار علاکے طبقہ سے تعلق رکھنے والے شخص پر طفرے سے بھر پورتا زیانے لگائے ہیں۔ ایسے افراد معاشرے اور ملت کی رہنمائی کا دعویٰ کرتے ہیں اور موقع بے موقع اپنی سفالتی خواہشون کی غلام گردش سے بھی باز پہن آتے ہیں۔ ایسی صورت حال، سماج میں ناسور اور کینسری طرح پنپ رہی ہے اور اس کا اگر وقت رہتے انسدادوں کیا گیا تو عین ممکن ہے کہ ایک دن پورا معاشرہ اس کی چیز میں آجائے گا۔

شموکل کو علمِ خوم سے بھی گہرا شفقت رہا ہے۔ اس کا شوت یہ ہے کہ ”مصری کی ڈلی“ کے علاوہ انہوں نے دیگر کئی انسانے لکھے ہیں مثلاً ”اقمیوس کی گروں“، اور ”بھگماس“ میں کھل کر علمِ خوم کی اصطلاحوں کا فنکارانہ اور حقیقی استعمال کیا ہے۔

شموکل کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کی نظر ہمیشہ جنس کی نفیات پر رہتی ہے۔ لیکن معروفی نظر سے دیکھا جائے تو شموکل احمد رواہت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ پہنچتے عصری حیثیت کے بھی ماں لک ہیں۔ موضوعات کی ندرت اور بقلمونی نے ان کے افسانوں کو ایک ملیدہ شخص عطا کی ہے۔ ان کے اکثر افسانے پیجیدہ سیاسی بصیرت اور عین عمرانی شعور سے بھی معمور معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے منفرد اسلوب اور لکھن اندماز پیان کی ہی کشمکش زاید ہیں کہ ان کے افسانوں کو عصری اردو ادب میں ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔



سہ ماہی

یادوں کی دستک

نعیم الرحمن

چلنے پہنے میں بھی ا؟ رام ملتا ہے، سونے جانے میں بھی سکون ملتا ہے، لکھنے پڑھنے میں بھی قوت اور توانائی ملتی ہے۔“

غالب شیریں بوس سے گالیاں کھا کے بے مردہ ہوئے تھے۔ صوفیہ احمد کہتی ہیں کہ ”کسی کی ڈاٹ میں بیار کا پہلو طلاش کرنا اور یہ پہلوں جانے کے دعاۓ اختم کی شیرینی کا مزالے کر ڈاٹ پلانے والے کو پیشی نہ کروں، کسی کی مخصوص باتوں میں روحاںی لطف حاصل کرنا، یہ شعور کی تعلیم مجھے بھی نہیں دی گئی۔ یہ شعور تو چیزے خود پر چکے ہیں میرے اندر؟“ گیا۔ مل کی، میری ساری ہمچواليں، محل کی چھوٹی بڑی سیلیاں، اسکوں کی ہندو مسلمان سب لڑکیوں کی کمی میں ہی یہ شعور پیوست تھا۔ کوٹ کوٹ کر لیجیم دے دی گئی تھی۔ ایسی تعلیم جو نظرت، مزان اور میلان کا جزو بن کر رہ گئی تھی۔ وہ دنیا ہی دوسرا تھی۔ اس دنیا کے لوگ ہی دوسرا تھے۔ اس کارگ، اس کی خوبیوں کی دوسرا تھی۔ ہم سب ایک طرح سے سوچتے تھے، ہستے تھے، روئے تھے، گاتے تھے۔ بے فکرہ کر بھی دوسروں کی فکر کرتے تھے۔“ کہتی ہیں۔

”میں نے جو محسوس کیا، میں لوگوں میں جو خوبیاں دیکھی ہیں وہ میں پہنچنے جا رہی ہوں۔ جن خوبیوں کو اور جن خشن کو میں نے اپنی؟“ گھومنے دیکھا ہے، وہ جا ہے میرے اپنے ہوں یا غیروں میں ہوں، ان کی خوبیوں کو اور ان کے خسن کو بیان کرنے کی ایک معمولی سے کوشش کی ہے۔“ صوفیہ اختم خود ہی اپنا شاہکار بن جاتی ہیں۔ خود ہی اپنی غزل بن جاتی ہیں اور خود ہی گلگانتی ہیں۔

خون سے گل کاسنگا کرتی ہوں
 میں خراں کو پہاڑ کرتی ہوں
 پیار کا ایک ذہن ہے میرے پاس
 میں بھی کاروبار کرتی ہوں

وہ بھتی ہیں۔ یہ ہے میری شاعری، میری تشتہ نگاری، میری مصوری کا خلاصہ اور اس کی روح! مجھے میرے پڑھنے والے اور کہیں طلاش نہ کریں، میں ان ہی سطروں میں ملوں گی۔ ان ہی سطروں کی بھتی سے لٹکی ہوئی غراموں میں، ظموں میں، شرپاروں میں ملوں گی۔ میری داغی زندگی اور کچھ نہیں! میری خارجی زندگی میں امریکا ہے۔ امریکا کی جگہ ہوئی زندگی ہے، گاڑیاں ہیں، مکان ہیں، لیکن ہاطن میں، اپنے خیریں، اپنی اسکس میں مجھے پانچا ہوا تو کوئی امریکا کی زندگی میں نہ باسکے گا۔ میں اپنے اپنی کی خاک ہوں، اپنی ڈیوری گی کی دھول ہوں۔ اپنے اپنی کے گزرے لوگوں کی یادگار ہوں۔ اس نئے عہد کے لوگ، نئے دور کی؟“ گھومنے سے، نئے زمانے کی عینک لگا کر مجھے ڈھونڈنا چاہیں گے۔

اردو میں خواتین قلم کاروں نے بہت کم آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ خواتین کی چند لوچپ آپ بیتیوں میں تو ایک حیدر کی ”کارہ جہاں دراز ہے“، ”شارع زیر است کی“ گئے دنوں کا سراغ ”ش فرخ کی“ ”چینے کا جرم“، عطیہ داؤ دی ”آئینے کے سامنے“، شاعر اور کالم ٹھاکر کشور ناہید کی ”مٹھی ہریادیں“، سیاسی کارکن فرشتہ بخاری کی ”یہ باری عشق کی باری ہے“، مشورہ شاعرہ ادا جعفری کی ”جو رہی سو بے خبری رہی“، صحافی شیم اختر کی ”ول میں چھپ کا نیز“، سعیدہ بانو احمد کی ”ڈگر سے ہٹ کر“، مسر ٹھنک اجم کی ”کہاں کہاں سے گزر گئے“، بیکم اختر حسین رائے پوری کی ستر سال کی عمر میں لکھی ”ہمکر“، بھوپال کی شہزادی عابدہ سلطان کی ا؟ پہنچنے ”عابدہ سلطان“، اور شوکت یعنی کی ”یادگی رہ گزر“، شماں ہیں۔ ان میں صوفیہ احمد تاج کی ”یادوں کی دھنک“ ایک اچھا اضافہ ہے۔

امریکا میں شیم بھارتی انسان، نگار اور شاعرہ صوفیہ احمد تاج کی خود نوشت۔ یادوں کی دھنک، فیصل؟ باد کے مثال پیش نہیں اپنے روایتی انداز اور ا؟ ب دتاب سے شائع کی ہے۔ دوسوچھن من صفات اور اخلاقیں صفات پر لکھن اور بلیک ایڈ وائٹ تصاویر سے مزین کتاب کی قیمت پانچ سورا پے اہمیتی مناسب ہے۔ سادہ اور پراٹ اسلوب میں صوفیہ احمد تاج نے اپنی یادوں میں قارئین کو شریک کیا ہے۔ روزمرہ کے واقعات، خاندان، احباب، دوستوں اور زندگی میں ملنے والوں کو تذکرہ بھر پور محبت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جس میں کوئی کروار اہم اور گرد نظر؟ تے ہیں۔ ایک عامر خاتون کی خود نوشت میں اپنی زندگی کی بھی جھلک نظر ا؟ تی ہے۔ خصوصاً دو جدید میں کئی لکھوں میں پچھلے ہوئے ایک ہی گھر ائے کے افراد کا برسوں ایک دوسرا سے دور رہنا تو اب عام بات ہے۔

صوفیہ احمد تاج، بہت اچھی شاعرہ اور ایک سادہ اور پراٹ ہے۔ وہ ایک عام سی بات اس طرح پیان کرتی ہیں کہ قارئی کے دل میں اتر جائے۔ وہ اپنے اور ادگرد کے لوگوں کے بارے میں کس طرح سوچتی ہیں۔

”ہاں یہ میں ہی ہوں۔ میں ہی تو ہوں جو اپنے دل کی گھرائیوں سے چاہتی ہوں کہ میں ان چینیں جگتا ہوئے جو کلم بند کروں۔ جن گھومنے میں چاہتی ہوں کہ میں ان چینیں جگتا ہوئے جو کلم بند کروں۔ جن گھومنے میں ان ہستیوں سے ملنے کا شرف بخشنا ہو میرے شعور کی دنیا میں چاند تاروں سے کم نہیں ہیں۔ ان کی شفقت اور محبت کی بھنی بھنی، بھنثی بھنثی پھواروں سے میرا وجد بھی شدہ ہے کا اور میری زوج ہی وہ شھنشہ رہتی ہے۔ ان ہستیوں کی پاتوں کا دلکش لہجہ اپنی بھنڑی بھنی اگلکیوں سے مجھے ہمیشہ چھوٹا ہے اور میرے اندر ہزار کروں کو جنم دیتا ہے۔ بھی تو مجھے لیکن نہیں؟ تاکہ اس دولت سے میرا دامن کیسے بھر گی، لیکن یہ چیز ہے کہ اس بے رنگ فضائیں دھنک کے ساتوں رگوں کی بوچھار مجھ پر بر پل ہوئی رہتی ہے۔ جس وقت بھی چاہتی ہوں ان رگوں سے خود کو بھوکیت ہوں اور اس انمول دولت کو سینے سے لکھتی ہوں۔ پھر مجھے اٹھنے پڑنے میں بھی لذت ملتی ہے،

ان ہی یادوں پر ان کی شاعری کا انعام ہے۔ ان ہی دھاگوں کو پوچھنے والے اپنے ماضی کی چادر ایسے ہی تھیں ہیں، جیسے ایک ماہر جلاہا کھٹی پر کپڑا بنتا ہے۔ ان کے اشعار میں بھی ان ہی مناظر کا خون دوڑتا ہے۔

وہ گھر کے لوگ، وہ مضمون سیدھے سادھے لوگ
وہ بہت سیکھتے بہر ماتے، مسکراتے لوگ
وہ صاف لوگ، وہ بلوٹ لوگ، چچ لوگ
کہاں گئے وہ جن کے بہار والے لوگ
نہ جانے کب میں، کس کھونے میں
نگاہیں ڈھونڈتی بھرتی ہیں کوئے کوئے میں

ایسے ہی سادہ و برکار اسلوب میں ماضی کی یادوں کو دہراتی صوفیہ اخجم تاج کی؟ پہنچنی "یادوں کی دستک" پڑھنے والوں کو مجھی اپنا ماضی یادداشت ہے۔ بھارت، پاکستان اور امریکا میں ہی ہوئی نسل کہاں کہاں اپنے پیاروں کی خلاش میں پھر لی اور انہیں یاد کرتی ہے۔ انہوں سے دوری کا کرب؟ جن کے انسان کا الیہ ہے۔ اس ا؟ پہنچنی میں تین ممالک کی تہذیب و ثقافت بھی نظر آتی ہے۔ سفر نامہ کارگ بھی اس میں موجود ہے۔ خاک نگاری کا انداز بھی کہیں کہیں حللتا ہے۔ ایک خاتون کی نظر سے اس تمام دور، افراد اور علاقوں کو دیکھنا قاری کے لیے ایک اچھا تجربہ ہوتا ہے۔ راشد اشرف زندہ کتابیں کے تحت ایک اور اچھی ا؟ پہنچنی شائع کرنے پماں کے مقتضی ہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ صوفیہ اخجم تاج کا تعلق بھارت سے ہے۔ پاکستان کے قارئین ان سے کچھ زیادہ آشنا نہیں ہیں۔ ●●●

"دھوڑو گے ہمیں ٹکوں ٹکوں، ملے کے نہیں، نایاب ہیں ہم"
اس سے بہتر اور پراشر تعارف کوئی مصنف اپنا کیا کر سکتا ہے۔ امریکا میں مقیم صوفیہ اخجم تاج اپنے نخلی گاڈ لے چھپرہ کی مسافت کا ذکر جس دل نہیں انداز میں کرائی ہے۔ وہ راستے اور وہ فرقہ کی ان کے ساتھ ساتھ کرتا ہے۔

"وہاں جانے کے لیے کوئی بڑی نہیں اور نہ رکشا۔ سوائے ٹمٹم ٹایبل گاڑی کے کئی اور سواری جاہی نہیں تھی۔ اس ٹمٹم کی ہوش باش اور نیل گاڑی کی چول چان کے قسم فضائل پہنچاں طرح ہمارتے کہ اسی ڈن پر، ہم لوگ نیل گاڑی میں بیٹھتے ہی بیٹھتے جھوٹنے رہتے اور ا؟ نے واپسی میں خوشیوں سے سرشار ہو جاتے۔ چھپرہ جانے کا موقع صرف گرمیوں کی چھٹیوں میں ملتا تھا۔ ایسی شدید گرمی کے خدا کی پناہ لیکن چھپرہ ایسا کیا؟ پاڈائیش سے ایک بارہم لوگ جب نیل گاڑی پر سوار ہو جاتے اور پکی سڑک پر اتر جاتے تو بس ایک دوسرا سیکھ کوئی بیٹھنے کو ملتی تھی۔ کہیں کوئی کوئی، چھپرہ کی چچھا ہٹ، کبوتروں کی غمغفوں میں پوکی فضا کچھ اس طرح تخلیل ہو کر دل دماغ کو سکون بخشی کہ شرکی گہما گہما، بھاگ دوز اور گندگی کا جود مانع پڑا۔ ہوتا وہ فراز زائل ہو جاتا اور سکون کا ایک جادو ہے۔ بشارکی طرح بہرہ کر دل دماغ کو تروتادہ کر دیتا۔"

اس دور کی زندگی؟ جو بظاہر بہت دشوار نظر آتی ہے۔ لیکن وہ لوگ سنتے مطمئن اور پرسکون تھے۔ ا؟ ج کے دور میں وہ سکون کی کوئی نہیں۔

"ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے کی جدید سہولیات کیاں میر تھیں ان دونوں؟ کوئی لاری، کوئی بیب، کوئی کار، کوئی موڑ سائکل تک جنمیں تھی۔ گاؤں؟ س کے لوگوں نے تو صرف ان پیڑوں کے نام ہی سنے تھے، انہیں دیکھا نہیں تھا۔ اب سوچتی ہوں کہ یہ سہولیات کس کے لیے ہیں؟ وقت کی بچت کے لیے؟ وقت کی بچت کس کے لیے ہے؟ اور پہنچانے کے لیے؟ اور پہنچانے کے لیے؟ اور کیا جاتا ہے؟ زیادہ عیش و عشرت کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے؟ وقت، وقت، وقت؟ خراس کا مصرف کیا ہے؟ ابا اور بھائیوں کا پچھی سڑک پر نیل گاڑی کے ساتھ ساتھ چلن، باشیں کرنا، موسم کی، خصل کی، قبیل داری کی۔ کیا یہ وقت گزارنے کا طریقہ نہیں تھا؟ یہ بھائیا اور ایک اچھا طریقہ تھا۔"

ماضی کی ایسی یادا؟ وہی اور مذکور شی ہر چیز؟ ٹکھوں میں تصویر ہو جاتی ہے۔ پھولوں میں اب بھی خوشیوں ہے لیکن اس سے وہ زمین وابستہ نہیں۔ اب سویل کی رفتار سے موڑوں میں ہم سفر کرتے ہیں، پڑا رکومیٹر کی رفتار سے ہوائی جہاز پر تیزی سے رہتی جاتے ہیں۔ لیکن نیل گاڑی کی تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین پر ٹھکنی رہتی۔ زمین کی ناک دھوں جس سے ہمارا وجود تیار ہوا تھا، وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ تھی۔ وہ رشتہ اب نہ رہا۔ اس رشتہ کی پیاس اُس لذت کی طرف صوفیہ اخجم اب بھی دوڑنا چاہتی ہیں۔ لیکن وہ تو بہت دور چلی گئی۔

سفید ساری میں لپٹا ہوانا می اماں کا سر ایا، ان کی مسکراہٹ، ان کی جیجی و پکار، ڈانٹ ڈپٹ، سب یہ بجود گیرے چھیسے ان کی نظریوں کے سامنے پر دے پر؟ تے رہتے ہیں۔ گاؤں؟ اس کا ایک ایک فریج، جو کہ سے سبندھیوں سے بھی بڑھ کر ہوتا تھا، رشتہ اور تعلق کا وہ احترام اب کہاں ہے، وہ سب نہ جانے اس بھری دنیا میں کہاں کہاں ہوں گے، سب یادا؟ نے لگتے ہیں تو ان کی؟ ٹکھوں سے بہتے ہوئے؟ نسوت جیسے اپنے قابو ہی میں نہیں رہتے۔ بہتے ہی جاتے ہیں۔

نخل آب

مجموعہ غزل

رفیق راذ

صفحات ۲۴۰

روپے ۵۰۰

9622661666

rafiqraaz1950@gmail.com

نیوپارک میں جشن ڈاکٹر عبداللہ: فرح کامران

کامران نے نظامت کے فراپن سنبھالے۔ پروگرام کا باقاعدہ آغاز مختلف ویٹو یوکل پینچ پر ڈاکٹر عبداللہ کی زندگی کے حوالے سے ایک ڈاکٹوری قلم سے کیا جیساں جس توہبت ہی مختت اور لکن سے ان کے دوست افضل عثمانی نے تیار کیا تھا۔ یہ ڈاکٹوری اصل میں تصویریوں کی زبانی ڈاکٹر عبداللہ کی علی گڑھ ایسوی ایشن کے قیام اور اس کے زیر انتظام ہونے والے مشاعروں کے حوالے اس ان کی جدو چہدکی بھائی تھی۔ اس ڈاکٹوری نے شروع سے لے کر آخوندک سماں میں کو متوجہ رکھا۔ اس کے بعد مقربن نے اٹھارہ خیال کیا۔ سب سے پہلے علی گڑھ المانی نیویارک کے صدر توری ہمدرم نے تظیم کے لئے ڈاکٹر عبداللہ کی راں قدر خدمات کو خراج چھیمن پیش کیا۔ ڈاکٹر صدیقہ صبا چھپلے 35 سال سے ہر سال ان کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کر رہی ہیں، ڈاکٹر عبداللہ اور ان کے منعقد کردہ مشاعروں کے حوالے سے بہت دلچسپ واقعات بیان کرنیا اور اس حوالے سے خوبصورت اشعار بھی سنائے۔ اضافہ حسین بھی ڈاکٹر عبداللہ کے دیرینہ ساتھیوں میں سے ہیں جو بہت محبت سے خاص طور سے کینیڈا سے اس پروگرام کے لئے تشریف لائے۔ انہوں نے مشاعروں کے سلسلے میں پیش ہونے والی مشکلات کا ذکر کیا اور کہا کہ ان مشکلات میں ڈاکٹر عبداللہ کی بے لوث اور مسلسل خدمات اس جشن کی متحقیق تھیں جس کا اہتمام طاہرہ حسین نے کیا ہے۔ ان کے علاوہ پروین شیرنے بھی حساب دوستیں چکاتے ہوئے ڈاکٹر عبداللہ کو یادوں کا گلف دستہ پیش کیا اور جشن کے انعقاد پر مبارک پیش کی۔ ڈاکٹر شفقت نے اپنی یاداشتوں پر بنی مضمون پڑھا بجکہ میری طالب اور قانع ادا نے نظمی خراج چھیمن پیش کیا۔ صاحب صدر پروفیسر یوسف شررنے ڈاکٹر عبداللہ کی فن و شخصیت پر پری تفصیل سے گفتگو کی اور ان کی شاعری پر ایک جامِ مضمون پڑھا۔ اس موقع پر طاہرہ حسین، اہلیان نیویارک اور مشاعرہ میٹی کی طرف سے ڈاکٹر عبداللہ کو ان کی خدمات کے اعتراف میں ایک شیلہ پیش کی گئی۔

ڈاکٹر عبداللہ نے طاہرہ حسین اور تمام شرکاء کا دلی شکر پر ادا کیا اور ایسوی ایشن اور مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں اپنے طویل سفر کی کھانی بہت ہی مختصر پر ائے۔ میں دلچسپ اندراز میں سنایں۔ ڈاکٹر عبداللہ اپنی تمام انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ایک اہبہ اچھے صاحب دیوان شاعر بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی خوبصورت نظموں سے مامعنی کو لطف اندروڑ کیا۔

امریکہ کی تیزی سے دوڑتی ہوئی زندگی میں اگر بھی کوئی اپنی زبان بولنے والا مل جائے تو قسم خود بخود رک جاتے ہیں۔ اپنی زبان میں گفتگو کی چند سماں میں پورے دن کی تھکن کو دور کر دیتی ہیں۔ اپنی تعلیم، بہتر روزگار اور پر آسائش زندگی کے خواب لئے پر دلیں میں قدم رکھنے کے چند روز بعد ہی اس پارے بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سب ویسا حسین نہیں، جیسا اُنکے اس پارے دھکائی دیتا ہے۔ اپنے اندر سلکت ہوئی آسودگی کی جھنون کو کرنے کے لئے لازم ہے کہ اپنی زندگی سے مصروفیت کا غلاف اتار کر کچھ لمحے اپنی ذات سے لپی ماضی کی پر چھایسوں میں گم ہو جائیں۔ اسی محفوظوں میں جائیں جہاں اپنی زبان میں اپنی تمہدید یہ اور شفافت میں رچے بے ماخوں میں اپنے لوگوں سے گفتگو کریں۔ اسے ہی لوگوں میں ایک اہم نام ڈاکٹر عبداللہ کا بھی ہے، جو رسول قبل یہاں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے آئے تھے، لیکن جلد ہی اس بات کا اندازہ کر لیا کہ زندگی ہزار نے کے لئے اپنی شاخت اور تمہدید کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔ اسی ضرورت کے لئے انہوں نے علی گڑھ المانی ایسوی ایشن کے قیام کی تجویز پیش کی اور اس کے زیر انتظام شعروں کا چراغ روشن کیا۔ چراغ کی نظرت ہے، جناب، بخانا اور بجھ جانا۔۔۔ لیکن اس کی لوگوں سکن تک قائم رکھنا اور پھر چراغ سے چراغ جلاتے رہنے کے لئے صرف جزبہ نہیں جنون بھی چاہئے اور بدوفوں ڈاکٹر عبداللہ میں موجود ہیں۔ بقول احمد فراز

اگر چہ زور ہواں نے ڈال رکھا ہے
مگر چراغ سے لوک سنجال رکھا ہے
ڈاکٹر عبداللہ نے پچاس سال تک اردو زبان کے چراغ کی لوگو سنجال رکھا ہوا ہے اور ان کی یہ کاؤں اس بات کی متعاقبی تھی کہ ان کی پیریائی کی جائے۔ جس طرح ایک شاعر دوسرے شاعر کو پیش ہونے والی مشکلات کا اندازہ لگاسکتا ہے اسی طرح اس بات کا اندازہ بھی ایک پیشتم ہی لگاسکتا ہے کہ مشاعرے کی مغلیں جانے والے کیا مشکلات ہو سکتی ہیں۔ طاہرہ حسین نے جو خوبی 20 سال سے زائد سے نیویارک میں کامیاب مشاعر کرواری ہیں، اس پذیریائی کا اہتمام کرتے ہوئے ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی اور ڈاکٹر عبداللہ کی خدمات کو خراج چھیمن پیش کرنے کے لئے 7 مارچ 2020 کو ”جشن عبداللہ“ کی تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب کی صدارت سینئر شاعر اور سماجی رکن پروفیسر

یوس شرحتے، مہمان حمومی ڈاکٹر عبداللہ، مہمان اعزازی اشفاق حسین تھے اور
نظامت کے فرائض راقم الحروف نے ادا کئے
تقریب کا آغاز خوش نصیب نے تلاوت قران پاک سے کیا۔ خوش نصیب کی
عمر صرف دس سال اور اج کل نوبیارک میں اپنی قابلیت کے جو ہر دکھارہ ہے
ہیں۔ طاہرہ حسین نے مہماں کو خوش آمدید کہتے ہوئے ڈاکٹر عبداللہ کا تعارف
کروایا اور ان کی دریہ نہ خدمات کو خراج تھیں پیش کیا۔ اس کے بعد فرج
بنکر پر فرج کامران

ڈاکٹر عبداللہ نے پچاس سال تک اردو زبان کے چڑائی لوکو سنپال رکھا ہوا ہے اور ان کی یہ کاؤں اس بات کی متفاہی تھی کہ ان کی پڑپیرائی کی جائے۔ جس طرح ایک شاعر دوسرے شاعر کو پیش ہونے والی مشکلات کا اندازہ لگ سکتا ہے اسی طرح اس بات کا اندازہ بھی ایک پنجم ہی لگ سکتا ہے کہ مشاعرے کی محفلیں جانے والے کو کیا مشکلات ہو سکتی ہیں۔ طاہرہ حسین نے جو خود بھی 20 سال سے زائد سے نیویارک میں کامیاب مشاعر کرواری ہیں، اس پڑپیرائی کا اہتمام کرتے ہوئے ایک ثقی روایت کی بنیاد پر اور ڈاکٹر عبداللہ کی خدمات کو خراج حسین پیش کرنے کے لئے 7 مارچ 2020 کو "جشن عبداللہ" کی تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب کی صدارت سینئر شاعر اور سماجی رکن پروفیسر یونس شرستے، مہمان خصوصی ڈاکٹر عبداللہ، مہمان اعزازی اشراق حسین تھے اور نظمات کے فرائض راقم الحروف نے ادا کئے

تقریب کا آغاز خوش نصیب نے تلاوت قرآن پاک سے کیا۔ خوش نصیب کی عمر صرف دس سال اور اج کل نیویارک میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھار ہے ہیں۔ طاہرہ حسینی نے مہماں کو خوش آمدید کرتے ہوئے ڈاکٹر عبداللہ کاظمی تعارف کروایا اور ان کی دیرینہ خدمات کو خراج حسین پیش کیا۔ اس کے بعد فرح

مکتبات کے تعلق سے ایک زبردست کتاب

مشائہیر کے خطوط

گوپی چند نارنگ

کے نام

مرتبہ

گوپی چند نارنگ

اس کتاب کی دو جلدیں مجھے موصول ہو گئی
ہیں۔ جلد ہی کچھ جلدیں اور منظر عام پر آ رہی ہیں۔ اس کتاب پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر نارنگ اردو ادب کے وہ ستارہ امتیاز ہیں کہ جن کی روشنی رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گی۔

مدیر سبق اردو

سبق اردو

ادبی و تہذیبی رپورٹر تاڑ
ڈاکٹر محمد ناظم علی

ارضیات غالب

۱۰۰ اغز لول پر مشتمل سلسائی مجموعہ

سمیل کا کوروی

ناشر: گولانج، لکھنؤ

غالب انسٹی ٹیوٹ، نیو دہلی کی تازہ چیکش

یوسف سلیم چشتی (کلام غالب کے شارح)

مصنف: عبدالسمیع

قیمت: سورودے
”یوسف سلیم چشتی کی تحریریں ادب کے طلبہ کے لیے بہت مفید ہیں۔ شاید ہی ادب کا کوئی ایسا طالب علم ہو جس نے ان کی شرح سے استفادہ نہ کیا ہو۔ آپ (عبدالسمیع) نے ذریعہ کا یاد کیا ہے اس کے لیے آپ مبارکباد کے متعلق ہیں۔“
(مشہد بایوگرافی)

کہت کبیر سنو بھی سادھو، اسی میں سائیں ہمارا

سفینہ سماوی

کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خود کو ایشور کے پر درکار چائے اور اس کی عبارت کے ساتھ ہی مختروں کا درد کیا جائے۔ اس عمل کے لئے ایک گرد (معلم) کی ضرورت بھی ہے کیون کہ بناؤ گرو کے عمل انجام نہیں دیا جاستا ہے۔ بھلکی، بھگوتا اور گورو، بھلکی کے راستے کے جاریہ ہم سنتوں میں۔

شالی ہند میں بھلکی تحریک کی تبلیغ و اشاعت میں رامانج کا اہم مقام ہے۔ انہوں نے شالی ہند کے پس انہوں کو اپنی مریدوں کی دعوت دی۔ انہیں مریدوں میں ایک نہایت معتربر مرید سنت کبیر داس بھی تھے جنہوں نے بھلکی تحریک کو پورے شالی ہندوستان میں عام کیا۔ ان کی پیدائش 11 جولائی 1470ء میں ہوئی۔

کبیر داس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک اہم کڑی کا کام کیا۔ ان کا نظریہ تھا کہ خدا یا ایشور، اس کا جو بھی نام ہو، لیکن وہ ایک ہے اور گرو کے ذریعہ خدا کی پیچان کی جا سکتی ہے۔ محض مسجد یا مدرسہ میں جانے سے ایشور تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہذا بیکر گرد (معلم) کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ صرف ایک ایشور (خدا) پر تھا اس وجہ سے انہوں نے مورثی پوجا یا کسی پتھر کی پستش سے انکار کر دیا۔ اس طرح کہا جاتا ہے کہ سنت کبیر کا نظریہ نہ ہب وحدانیت سے مたاثر تھا۔ اس سلسلے میں گوپی چند نارنگ رم طرازیں:

”وید و انت کے مطابق رامانج نے بھی وجود حقیق خدا نے مطلق کو قردار دیا لیکن مذکوری ضروریات کے تحت اس نے بھروسہ تھوڑی تیزی ”ایشور“ یعنی مالک کل کے نام سے کی۔ بھی دنیا کا خالق اس کا پالنے والا اور اس کو نیست و نابود کرنے والا ہے۔ یہ صفات اور ذات و دنوں کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ ایشور کا یہ تصور بہت کچھ اسلام کے تصور الہ سے ملتا جلا سے۔“

بھلکی تحریک کی زرگن شانخ کے علمبردار کبیر داس بنیادی طور پر ایک مصلح قوم تھے اور انسانی زندگی کی مسادات ان کی انسان دوستی پر قائم تھی۔ ان کے لئے انہوں نے بڑے غور و فکر کے بعد نظریہ توحید کو اپنایا۔ وحدانیت کا یہ نظریہ ہندوستان میں وید کے زمانہ سے ہی موجود تھا اور ہزاروں سال بعد اسلام بھی اسی نظریہ کو لے کر ہندوستان میں وارد ہوا۔ ان دنوں نماہب کے سرچشمے سے

ہندوستان میں عربوں کی آمد نے ہندوستانیوں کو ایک نئی قوم سے روشناس کر لیا۔ عربی قوم تہذیب و تقدیم اور مذہبی عقائد کی بنیاد پر ہندوستانیوں سے قطعاً مختلف تھی۔ عربی ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے تھے اور خرید و فروخت کر کے واپس چلے جاتے تھے۔ لیکن ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو ہندوستان میں ہی شادی کر کے یہاں کے باشندے بن گئے۔ عربوں نے جب یہاں قیام کرنا شروع کیا تو اپنے مذہبی عقائد کو بھی عام کیا۔ چنانچہ 636ء میں عربوں نے مالا بار کے مقام پر چلی عرب بھی بسائی۔ نئے مذہب کا اہل ہبوب نے گرم جوش سے خیر مقدم کیا۔ اب اس مقام پر مساجد بھی تعمیر ہوئے لیکن اور مذہب اسلام کو استحکام ملا۔ ۹ ویں صدی میں مالا بار کے باشنداء پاڈشاہ اسلامی نظریات اور تعلیم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد مسلم قوم نے تال ناؤ کے شرقی ساحل اور کاہنے کے غربی ساحل پر اپنی مستقل بستیاں بنالیں اور مقامی باشندوں کو اسلامی تعلیم و تدریس کے ذریعہ مسلمان بنانا شروع کر دیا۔

اسلام کی اس پہلی امن تو سیع کواس وقت زبردست ضرب لگی جب شالی ہند میں واقع سندھ پر محمد بن قاسم نے قبضہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم قوم کو بیرونی طاقت سمجھا جانے لگا۔ اس کے تقریباً تین سو سال بعد محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور اس نے ہندوؤں اور ان کے مندوں کو سماز کرتے ہوئے گجرات تک قبضہ کر لیا۔ اس زیادتی کا اثر یہ ہوا کہ ہندو قوم مسلمانوں کو غیر ملکی اور اپنا دشمن تصور کرنے لگی اور انہوں نے اسلام قبول کرنا بھی بند کر دیا۔ اس طرح جو ایک طرف مسلم قوم پر امن طریقے سے اسلام کی تبلیغ کرنے میں کامیاب ہو رہی تھی اس کی اس پہلی مہم کو ہتھیار بند حملہ اور دوں نے بے حد نقصان پہچایا۔

محض اسلام کا مقابلہ کرنا آسان کام نہیں تھا بالخصوص ان کے مذہبی عقائد کی تردید کرنے کا حوصلہ تھے کہ کام تھا۔ اس مشکل کام کا ذمہ جگت گروگنک آج اپریئے نے لیا۔ انہوں نے ازسرنو و پیروں کا مطالعہ کیا اور پھر اس تیجے پر پہنچ کر مورثی پوجا کی تردید کی اور ایک خالص ملک کا تصور پیش کیا۔ جس کو ایشور کہا گیا۔ جگت گرو کے بعد اس اہم کام کی ذمہ داری رامانج نے پوری کی۔ انہوں نے یہم مذہبی صحیفہ ”بھگوت گیتا“ کی پیروی کی اور اسی کتاب میں بتائے گئے بھلکی کے راستے کو مجات کا راستہ بتایا۔ رامانج کی بھلکی تحریک کے مطابق ایشور ایک ہے اور وہی حق ہے باقی سب فریب ہے ایشور تک رسائی حاصل

اور اس عظیم حرکت کا ظہور ذرے ذرے میں ہے۔
کوئی سنتا ہے گیاں راگ گنگ میں، اوچ ہوتی پانی
سب گھٹ پورن پور رہا ہے، سب سرن کے کھانی
جو تن پا یا گھنڈ دیکھا یا، تر سنا نہیں بجھانی
امرت چھوڑ گھنڈ رس چاکھا، تر سنا تاپ تپا لی
اوون انگ سوا گل پا جا بایے، سرت سرت سحابی
کہیں کیر سنو بھی سا دھو، بھی آ وکی با فی
یعنی کہ اسماں میں ایک راگ گون رہا ہے اور اس کا آہنگ ہر شے میں
موجود ہے۔ خالق کائنات نے اس راگ کو باش کی صورت میں بر سادیا ہے اور
اب یہ ہر وجود میں جذب ہو گیا۔ وجد کوآ چنگ جب آسمانی راگ کے آہنگ سے
ملتا ہے تب ہی وحدت کا عرفان حاصل ہوتا ہے اور امرت کی الذت ملتی ہے۔ یعنی
کہ کائنات کی ہر شے میں خدا بنا ہوا ہے۔ بس ضرورت ہے کہ اپنی چشم بصیرت
سے اس کو پیچان لیا جائے۔ مشہور شاعر مزاغال بھی کائنات کے تحرک نظام کی
تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ربط یک شیراز و حشت ہیں اجزائے بہار
سزہ بے گانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا
لینی کائنات میں چاند، ستارے، سیارے اور کہکشاں خاص اصول و
ضوابط کے تحت گردش کر رہے ہیں۔ زمین کی ہر شے اپنا ایک مکمل نظام رکھتی
ہے۔ پیڑو دھنے، پھول پھل وغیرہ ایک طے شدہ نظام کے تحت نشونما پاتے ہیں۔
دریا کی روافی، بارش کا پانی، بادوں کا گرجنا اور موسوں کا تجدیل
ہونا وغیرہ سمجھی اپنا انداز ستور حیات رکھتے ہیں۔ اور جب تک دنیا قائم رہے گی تمام
اشیاء تحریر ہیں گی اور جیسے ہی دنیا کا یہ نظام جامد ہو جائے گا کبھی چیزیں ایک
ایک کر کے فنا ہو جائیں گی۔

کیمیر کا خیال ہے کہ خالق اور مخلوق میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں ایک ہی ہیں۔ مخلوق کو فنا ہو کر خالق میں ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد مخلوق کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ رہتا۔ تجھیکی کا عمل بیشہ چاری و ساری رہے گا اور کائنات تجھیک کے عمل کو جاری رکے رہے گی لہذا کبیر داں کہتے ہیں۔

غلق میں غلق، غلق میں خالق، سب گھٹ رہیا سماں
 مائی اک ایجک بھاتتی کرے، سماجی ساجن ہارے
 نہ پچھوپچھ مائی کے بھانے، نہ پچھوپچھ کھارے
 چونکہ برہم یا خدا یا رام سب کے اندر موجود ہے اس لئے تمام اشیاء
 کے اوصاف بھی الگ الگ ہونے کے باوجود رام کے اوصاف ہیں اور تمام
 وصف کا کلپی و خود خدا ہے۔ اسی لئے شہنشہر کو ہلکا کہا جاسکتا ہے، نہ بھاری، نہ
 جوان کہا جا سکتا ہے نہ بڑھا، بلکہ خدا یا رام کو اوصاف کا مجسمہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا۔

کبیر داں للختے ہیں۔
ایک کھوں تو ہے نہیں، دوئے کھوں تو گاری
ہے جیسا تیسرا ہے، کچھ کبیر و چاری
یعنی لا تخدرا و اوصاف کے مالک کواس کے وصف کی بنا پر بھی ایک سے

سیراب ہو کروہ اس تیجہ پر ہنچے کہ معرفت کا راستہ کی خاص مذہب سے ہو کر نہیں گزرتا بلکہ اس کا تعلق توحید ذات سے ہے۔ اپنے انھیں بیش قیمتی خیالات کو انھوں نے دو ہوں اور ساکھیوں کے کوپ میں پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں مشہور ناقہ و محقق گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

”معرفت کے اس نئے راگ میں جو کیمیرا چھیڑا
- عام ہندوؤں اور مسلمانوں کے گھرے روحانی چذبات
سموئے ہوئے تھے۔ ان میں عاشقانہ ذوق و شوق، سوز و ساز
اور تسلیم و رضا کے ساتھ ساتھ مصلحانہ بلکہ جا ہانہ جوش و خروش
بھی ہے۔ ایک طرف وہ نغمہ عشق ہے، ذات الہی کی محبت اور
مرشد کی عقیدت سے معمور اور دوسرا طرف نفرہ بُنک ہے
ظاہری مذہب کی رسوم و روایات، عقائد اور عبادت کے
خلاف۔“ ۳

کبیر کے متصوفانہ خیالات سے ان کے معرفت کے نظریہ کو بھیجئے میں
مدلتی ہے۔ وحدانیت کا نظریہ پونکہ ہندوستان میں قل از آدم اسلام ہی موجود تھا
چنانچہ یہ کامی نظریہ بھی بن گیا۔ اس وقت ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی
لیکن یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ کبیر نے اکثر بُت کے اس نظریے سے متاثر ہو کر
وحدانیت پر لیقین کیا ہوگا۔ ایسا بالکل نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کبیر
نے ہندوستان میں نظریہ وحدانیت کو قبول کیا ہوتا جو اسلام کے ساتھ ہندوستان
میں داخل ہوا تو کبیر بھی مذہب اسلام کے مقدمہ ہوتے یعنی ایسا نہیں ہے۔ اسلام
مذہب کے متعلق ان کا نظریہ یہ تھا کہ یہ مذہب وحدانیت کا حامی ترقیے لیں اس کا
خدا صرف مسلمانوں کے لئے خصوص ہے، کافروں سے اس کا کوئی تعلق نہیں
ہے اور اس کی توحید میں دوئی کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ سنت کبیر اس کا یہ نظریہ
سائنسی تجزیہ پر پورا اترتا ہے۔ اُسیں اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کا اللہ
ہندوؤں کا برہم اور بابل کا آسمانی باپ شونیہ (صفر) کے بعد کوہ کیفیت ہے جو
پیدا اش شی کے ساتھ کیمیائی ردعمل کے طور پر موجود میں آئی اور جس کو پہلی حرکت
کے نام سے پکارا جاسکتا ہے۔ یہی حرکت انسانی وجود کے مودار ہونے میں اہم
مقام رکھتی ہے۔ اسی پہلی حرکت کے ہزاروں لاکھوں سال کے بعد ڈاروین کا

سپک' (Speck) پاویدک کن (d.k) وجود میں آیا۔ اس حرکت کا تسلیل اور فضائیں ہونے والے لغیورات مستقل کیمیائی ر عمل ک تیجیں ہیں اور چونکہ یہ کیمیائی ر عمل اور ان سے پیدا ہونے والی حرکات اور تغیرات خود پر خود ہوتے رہتے ہیں لہذا ان کو بہم، خدا یا آسمانی باب کا لقب دے دیا گیا ہے۔ اسی کیمیائی ر عمل کا نام کبیر نے "رام" رکھ دیا ہے۔ کبیر داں کے رام سے مراد اسی قدرتی نظام کائنات سے ہے جو سب کے لئے ہے۔ یہ نظام ہر خرد ہر خلطہ، ہر ذہب اور ہر جماعت کے لئے یکساں طور پر مستقید ہے۔ یہ کسی کے لئے بھی مخصوص نہیں ہے۔ سب کچھ کائنات کی اسی حرکت کی وجہ سے ہے اور سب کچھ خشم ہو کر دوبارہ اسی کائنات کا حصہ بن جائے گا۔ لہذا کبیر نے اسے تو حیدر کہا ہے۔ ان کا بھی نظریہ مورتی پوچھا کی تردید کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خدا کوئی جامد طاقت نہیں ہے بلکہ خدا یا رام دنباڑا کے ذرے میں سما ہوا ہے۔ رام ایک مسلسل حرکت ہے

حقیقت کا علم رکھنے کے سب کسی چیز کے حصول کے لئے یہ تو پریشان ہوتے ہیں اور نہ یہ کسی چیز کے جدا ہونے پر غم کاظمہ کرتے ہیں۔ کبیر داں لکھتے ہیں۔
جل میں کبھی، کبھی میں بل ہے، باہر بھتیر پانی
پھوٹاں لبھ مل جل ہی سانا، پتھر کھنگیانی
اس صحن میں پروفسر گلیل الرحمن رقم طراز ہیں:

”وجود میں کائنات کا ہنگامہ ہے کہ جس کی وجہ سے
مادی زندگی کی غلطیوں سے آزادی مل گئی۔ دلوں وجود یعنی
داخلی اور خارجی ایک ہو گئے کہ جس سے ایک آکاش بن گیا،
وجود کے اندر محمد و داود اور لاہمود ایک ہو گئے اور آہنگ کی وحدت
وجود میں آگئی۔“

نجات یا کتنی دقیقی ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ انسان کی روح جسم سے
پرواہ کر کے مالک حقیقی میں جاتی۔ جسم کے تمام عناصر اپنے اصل عناصر میں
مل جائیں اور انسانی وجود فنا ہو جائے۔ اس عمل کو فنا اللہ کہا جاتا ہے۔ دوسرا
نجات وہ ہوئی جس میں وجود عناصر کی خاص ظہور ترتیب ہوئے علم کی مدد
سے اپنی زندگی کو اس طرح ڈھال لے کر اپنے وجود سے باہر نظر آنے والے
موجودات کو اپنے ہی وجود کا حصہ تسلیم کر کے مختلف انواع جذبات سے برا
ہو جائے۔ ایسا انسانی وجود اپنی زندگی میں صوفی کہلاتا ہے۔ ہالی الذکر نجات یعنی
وجودی نجات کے متعلق کہیں داں کے پچان

حیرت حیرت ہے سکھی، رہیا کبیر حیرت ای
بوند سانی سدمیں، سوکت حیری جاتی

الٹ ساما آپ میں پر گئی جوت انت
صاحب سیوک ایک سنگ ہیلیں سوابست
اس سلسے میں گلیل الرحمن لکھتے ہیں:

”کبیر نے انسان کے جو دو عظیم ترقیات دیا ہے، اسے
تلخیل کا حسن جانا ہے، دراصل بالطفی آگئی نے حسن کا یہ احسان
عطای کیا ہے۔ کہتے ہیں خالق تم میں ہے اور تم خالق میں ہو، اسی
طرح کہ جس طرح برگد کے شیعی میں اس کے پتے، پھول،
پھل وغیرہ ہیں ”آپا مرے ہے آپے، بولے آپے سجن ہارا“ یعنی
وہ خود اپنے نقش بیٹھا باتیں کر رہا ہے اور خود وہی مالک اور خالق
ہے۔“

یہ دنیا قریب ہے۔ کائنات فنا ہو جانے والی چیز ہے یہ بیشہ باقی نہیں
رہے گی۔ کائنات کی تخلیق یا پانچ عناصر سے ہوئی ہے جن میں زمین (مٹی)، یانی،
آسمان (شوہی)، آگ (روغنی) اور ہوا شامیل ہیں۔ چونکہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم
ہے کہ کائنات کی بھائیں پانچ عناصر پر مشتمل ہے اور انہیں کے باہمی ربط سے
اس کا وجود قائم ہے لہذا ان میں سے ایک بھی غصراً اگر ختم ہو جائے تو باقی چار بھی

دو کہنا بڑی بات ہو گی کیوں کہ وہ خالق کائنات بہت عظیم ہے۔ مشہور شاعر خواجه
میر درد گی اسی خیال کی تائید کرتے ہیں۔

وحدث میں تیری حرف دوئی کا نہ آسکے
آنینہ کیا جاں تجھے منہ دکھا سکے

کائنات کے تمام جانداروں کے جسم کی تخلیق ہوا، یانی، مٹی اور آگ

جیسی قدرتی اشیاء سے مل کر ہوئی ہے۔ پانی، مٹی اور آگ سے جسم کی تخلیل ہوتی ہے

(حالانکہ مذہب اسلام کے مطابق انسان کی تخلیل صرف مٹی سے ہوتی ہے)
اور ہوا جسم میں جان ڈالنے کا کام کرتی ہے۔ یعنی جب جسم تیار ہو جاتا ہے تو ہوا

اس میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ ہوا جسم میں خون کی گردش میں مدد کرتی ہے جس سے جاندار کو زندگی عطا ہوتی ہے۔ زندگی کا سفر جسم میں جان پڑنے سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور مجسے مجسے جانداری عمر گزرتی جاتی ہے ہوا لی گر دش کی رفتار کم ہوتی ہے

جانی ہے اور جاندار کی رگوں میں دوڑنے والا غونج تجدید ہونے لگتا ہے۔ جب خون کا تجدید ہونا اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ ہوا اس کو آگے نہ بڑھا سکتے تب ہوا

جسم سے خارج ہو کر باہری دنیا میں ختم ہو جاتی ہے یعنی اپنے خالق سے جانی ہے۔ اس طرح جاندار کی موت و اُنچ ہو جاتی ہے۔ اسی ہوا کو روح (آتما) کائنات دیا جاتا ہے۔ جونہ تو جانی جا سکتی ہے، نہ مٹانی جا سکتی ہے، نہ وہ سوھنی ہے نہ لیں ہوئی ہے اور نہ کائی جا سکتی ہے۔ کبیر داں اس آتما (روح) کے متعلق فرماتے ہیں۔

نا ایہ تباہ کہا وے سیکھ، نہ ایہہ جیوے نہ مرتا دیکھ
اس مرتے کو جو کوئی رووے، جورو وے سوئی پت کھووے

بوند سانی سدمیں، سوکت ہیری جائے
سمو سانا بوند میں سوکت ہیری جائے

کبیر داں کہتے ہیں کہ بوند یعنی آتما (روح) سمندر یعنی پر ما تما (خالق) میں نہ
ہو جاتی ہے تو اس کا علیحدہ وجود ہاتھ نہیں رہتا ہے لیکن یہی اس کا اصل ہے اسے

وہیں جانا ہے جو اس کا موجب ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ سمندر بوند میں سا جائے تو ہمیں اصل سے مل جاتا ہے۔ وہ اس لئے کہتے ہیں کہ کبیر کل اور بزر یعنی آتما اور پر ما تما میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ مرزاغالب یعنی اسی خیال کا اعزاز کرتے ہیں۔

ع قطرہ دریا میں جوں جائے تو ریا ہو جائے

ع عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

کبیر کا کہتا ہے کہ ایشور اور انسان ایک ہی ہیں اس انسان کو اپنے وجود کی اصل شاخت نہیں ہے۔ جو لوگ دونوں کو الگ سمجھتے ہیں وہ لام ہیں۔

ع کہے کبیر تک دوئی سادھے، تن کی متی ہے موہی
عناسر کے ظہور ترتیب کا علم نہ رکھنے والا گرامی کے سب مختلف عناصر کو

مختلف اشیاء کو کھجھ لیتا ہے اور وحدث سے دوری اختیار کر کے فریب کا ہیکار ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ من عناسر سے اس کا وجود ہوا ہے انہیں

عناسر سے دوسرا چیزیں بھی ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ لہذا دوسرا اشیاء بھی ایک ہی
بنیادی چیز کا جز ہے اور ان کا عالم وجود میں آنا اور پھر لا وجود میں چلا جانا درستی
نظام یعنی کیمیائی و طبیعیاتی عمل اور عمل کا نتیجہ ہے۔ لیکن جو عالم ہیں وہ اس

تہذیب اور وسیع تر مشرب کا اشارہ یہ ہے جس کا مقدمہ تمام نہ اہب کی وحدت کے رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنا تھا۔ اس میں نارگ صاحب کا قول ملاحظہ فرمائیں:-

”کبیر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی اصطلاحوں سے یکساں کام لیتے ہوئے اس صداقت پر زور دیتے ہیں کہ دونوں نہ ہوں کی روحاںی بیانی دیکھ ہے۔“

کبیر نے... ایک ایسی شترک را کی طرف اشارہ کیا جو اس منزل کو لے جاتی ہے جہاں کعبہ اور کاشی یا رام اور رحیم کے تصور میں مختارت نہیں رہتی۔“ ۲

تمہرے خریر کے طور پر کہا جاستا ہے کہ بکیر داس نے جس رام کی تخلیق کی اس کے ساتھ وہ تمام اوصاف حیدہ جزو دیے جو برہم یا خدا کے ساتھ نسلک تھے۔ رام تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بھی انہوں نے انھیں طریقوں کی تقدیم کرنے پر زور دیا جو ربهم اور خدا تک پہنچنے کے لئے ویدوں اور قرآن کریم میں درج ہیں، جن کو سنت حضرت صوفی کبیر داس اپنے واعظ کے ذریعہ عام نکل پہنچاتے ہیں۔ یقیناً تجھیت صوفی کبیر داس اپنے فکری کلام اور اعلیٰ خیالات کی بنا پر مشورہ و تقویٰ ہوئے اور ادبی دنیا میں ایک مضمون مقام حاصل کیا۔

حوالی:-
۱۔ بیانیت سنگھ مطیر، اردو کامل باغی شاعر کبیر، کایا بجلی کیشنر، بہادر گڑھ، 1984ء، صفحہ 12۔

۲۔ گولی چند نارگ: اردو غزل اور ہندوستانی ذہن تہذیب، قوی کوںل برائے فروغ اردو زبان، بی بی دبلی، 2013ء، صفحہ 85۔

۳۔ گولی چند نارگ: اردو غزل اور ہندوستانی ذہن تہذیب، قوی کوںل برائے فروغ اردو زبان، بی بی دبلی، 2013ء، صفحہ 87۔

۴۔ ہمیں اعلیٰ الرحمٰن: کبیر، عرفی بجلی کیشنر، گرگاؤں، 1997ء، صفحہ 59۔

۵۔ ہمیں اعلیٰ الرحمٰن: کبیر، عرفی بجلی کیشنر، گرگاؤں، 1997ء، صفحہ 76۔

۶۔ گولی چند نارگ: اردو غزل اور ہندوستانی ذہن تہذیب، قوی کوںل برائے فروغ اردو زبان، بی بی دبلی، 2013ء، صفحہ 88-89۔

خشم ہو جائیں گے اور کائنات کا وجود فتا ہو جائے گا۔ ہندوستانی فلسفے کے مطابق دنیا کے فایسے ہو گی کہ ہر سمت پانی ہی پانی ہو جائے گا اور سب کچھ ڈوپ کرنا ہو جائے گا۔ باطل اور قرآن کریم کے مطابق سورج اپنی جگہ چھوڑ کر سوانحے پر آجائے گا اور ساری دنیا جعل کر خاتمہ ہو جائے گی۔

دنیا کا ختم ہوتا ہے۔ اسی لئے صوفی اور مہاتما دیبا کو صرف ایک خواب سے تحریر کرتے ہیں۔ جس طرح خواب کی حقیقت صرف اسی دم تک ہے جب تک وہ ظفر آتا ہے اسی طرح دنیا کی حقیقت بھی اسی بل تک ہے جب تک قیامت نہیں آتی ہے۔ دنیا کے وجود کا ٹھہر کر ختم ہو جانا لازمی ہے۔

ع نہیں برہانی، پڑھنے نہیں، پڑھنے تو یعنی نہیں، پڑھنے تو یعنی نہیں، پڑھنے تو یعنی نہیں ہے، سب کو فنا ہوتا ہے۔

کبیر کا خیال ہے کہ خالق کائنات سے عشق کرنے والوں کو بھی موت نہیں آتی، وہ موت جو انسان کو فنا کر دے۔ موت تو زندگی کا صرف ایک تحریب ہے، محبت کی شدت کا خوبصورت نتیجہ ہے۔ موت وہ کرشمہ ہے جو انسان کو خالق پر وازعطا کرتی ہے اور وہاں تک پہنچادیتی ہے جہاں محبوب حقیقی رہتا ہے۔ خالق کائنات سے چاٹھنے ہی موت کے خوف کو ختم کر دیتا ہے کیون کہ یہی موت کو صرف ایک ذریعہ ہے اس عظیم خالق سے وصال کا، اس سے جر کے درد کو دور کرنے کا محبت موت سے کہیں زیادہ گہری اور پر اسرار ہے اور اس کی شدت اس قدر تیز ہے کہ موت کو خود پر خود قریب آنا پڑتا ہے اور عاشق کو صل کے لئے نصیب ہوتے ہیں اور موت خود پاٹ پاٹ ہو جاتی ہے۔ محبت کا کچھ ٹنک ہو جاتا ہے اور اس میں دوئی کی تھیجاش نہیں رہتی۔ کہ بکیر داس فرماتے ہیں۔

جب میں تھا گروہ بنیں، اب گروہ میں ہم نہ نہ ہ پر یہی اس ساکری تا میں دوسرا نہ ہ

موت جسم کو فنا کر دیتی ہے لیکن روح زندہ رہتی ہے، وہ پر اسرار دائرے میں اپنی تو انی کا احساس لئے رہتی ہے، وہ تو پارس ہے اس سے جھوکر تو موت بھی سونے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دنیا جو لوہے کی مانند ہے، اس پارس نے اسے بھی سونا بنا دیا ہے۔

پارس روپی جو ہے لودہ روپ سسار
پارس سے پارس بھیا پر کہ بھیا سسار

کبیر کا پیام یہ ہے کہ دنیا میں اچھے عمل کئے جائیں۔ لوگوں سے محبت و خلوص سے ملا جائے اور اس چھوٹی سی زندگی میں خالق کائنات کو یاد کرتے ہوئے چاہی کے راستے پر گامزن رہا جائے تاکہ انسان اور انسانی رستوں کا شعور باقی رہے اور کسی بھی قسم کے فتنے سے نسل انسانی پاک رہے۔ نہیں، مععاشرتی اور سماجی انتشار پر تھی خالص ہو سکے اور اعلیٰ وعدہ انسانی اقدار کی تکمیل میں معاون ثابت ہو۔

کبیر کی تعلیمات میں تصوف، ناتھ بھنپھوں اور ویدک اصولوں کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کبیر اسی عظیم تہذیبی اخلاقی کے گھم کا حصہ ہیں جو، مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے شروع ہوا تھا۔ کلام کبیر اسی نتی

ڈاکٹر منصور خوشنتر

تو بھی ہماری یاد میں تڑپے خدا کرے
مجروح ہو بلا سے ترے حن کا غرور
پر مجھ کو چشم شوق نہ دیکھے خدا کرے
کھو جائیں تیرے حن کی رعنایاں تمام
تیری ادا سی کو نہ بھائے خدا کرے
میری ہی طرح کشتہ دل ہو تری تباہ
طفاق انے زور کا اٹھے خدا کرے
راہوں کے پیچ و خم میں رہے تا حیاتِ گم
ہے روشنی داغ جگر بے وفا سکی
پروفیسر اولیس احمد دوراں نے ظمیں کے علاوہ
غزلیں بھی کہیں۔ ان کی غزلیں بھی کافی متاثر کن ہوا کرتی تھیں۔ چیز ہے ان کی
غزلوں کے پہنچ اشعار:

ایسا نہ ہو یہ رات کوئی حرث اٹھا دے
انھٹا ہے ستاروں سے دھواں جاگتے رہنا
☆☆

بہتی نہیں ہے مرد کی آنکھوں سے جوئے انک
لیکن ہمیں بتاؤ کہ ہم کس لئے نہیں
بے داروں کی دنیا بھی لئی نہیں دوراں
اک شع لئے تم بھی یہاں جاگتے رہنا
☆☆

ہم شاعر جیات ہیں ہم شاعر جیات!
دوراں وہ سرخ رنگ کا پرچم تو دو ہمیں
کچھ درد کے مارے ہیں کچھ ناز کے ہیں پالے
کچھ لوگ ہیں ہم جیسے کچھ لوگ ہیں تم جیسے
☆☆

سب مستیوں میں پھیکو نہ پتھر ادھر
دیوانو! اس دیار میں شمشے کے گھر بھی ہیں
شاید کسی کی یاد کا موسم پھر آ گیا
پہلو میں دل کی طرح دھڑکنے لگی ہے شام
☆☆

ان مکانوں میں بھی انسان ہی رستے ہوں گے
رنقیں جن میں نہیں آپ کی محفل کی سی

اویس احمد دوراں معروف ترقی پسند شاعر، ادیب، اک بے وفا کے
نام جیسی ظمیں اور اپنی خود نوشت میری کہانی کے لیے مشہور ادھر و شہر و ادب کا
ایک معتبر اور اہم سtronگ میگی آنکھ کارگر ہی کیا۔ اپنے اشعار سے لوگوں کو جاتے
رہنے کا مشورہ دینے والا شخص زندگی کے مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے تھک تھا
کر خود ہی بیشمہ بیشمہ کے لیے سوگیا: ان اللہ و ان الیہ راجعون!

اے ہم نشو! شب ہے گران جاگتے رہنا
ہر لمحہ ہے یاں خطرہ جاں جاگتے رہنا
بزرگ شاعر اولیس احمد دوراں کا طویل علاالت کے بعد ۱۹۸۰ء کو دریافت کے پارس اپنال میں انتقال ہو گیا۔ ۱۹۸۵ء کو دریافت
خلع کے کوئی گاؤں میں پیدا ہوئے، محلہ فیض اللہ خاں میں سکونت اختیار کی
اور للات نارائن متحملایونہوشی کے، کے۔ ایں۔ کانج دریافت کے شعبہ اردو سے
سکدوش ہوئے۔ آپ کے دادا خدا بخش جاں مرحوم چاند پور مشرقی یونی کے
پاشنده تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر محمد حسن صاحب کی فرمائش پر خود نوشت سوائی عصیری
لکھنا شروع کیا جو ”میری کہانی“ کے نام سے بہت تاخیر سے شائع ہوئی۔ ان کی
چار کتابیں ”ابائل“ (۱۹۸۲ء)، ”لکھوں کی آواز“ (۱۹۷۴ء)، ”تقدیری منزل
سے“ (۱۹۸۹ء)، ”میری کہانی“ (۱۹۹۹ء)۔ ان کے لائق فرزند پروفیسر جمال
اویس نے ۲۰۱۵ء میں ”اویس احمد دوراں: ایک بازدیدی“ کے نام سے ایک کتاب
شائع کی۔ اویس احمد دوراں ایک شریف انسان تھے۔ زندگی کے شروعاتی دور
میں کمیٹی پارٹی کے ایک اہم رکن رہے۔ لیکن بعد میں مذہبیت کی طرف مائل
ہوئے، صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے۔ اور پھر ایسا بھی وقت گزار جب آپ نے
اپنے محلہ کی مسجد میں اذان دینے کے فرائض بھی انجام دیئے۔

پروفیسر اولیس احمد دوراں ایک مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ جنواڑی
لیکھ سکھ (جبھریت پسند صنفیں) کے صدر تھے۔ اُمّن ترقی اردو ضلع شاہ،
دریافت کے سکریٹری بھی رہے۔ انہوں نے شاعری کی شروعات ۱۹۵۲ء سے
کی۔ جب کہ ۱۹۵۶ء سے تقدیری مضامین لکھنے لگے۔ ان کی مشہور نظم ”ایک
بے وفا کے نام“ بہت مقبول ہوئی جسے سیریز کے مالک گلشن سارانے عطاۓ
اللہ خاں کی آواز میں جاری کیا تھا۔ بعد میں اویس احمد دوراں نے اپنی نظم ایک
بے وفا کے نام چوری کا لازام لگاتے ہوئے اپنی سیریز کے مالک پر مقدمہ درج
کیا تھا لیکن پیچ میں ہی اس کی موت ہو گئی۔ ایک بے وفا کے نام نظم پیش
کر رہا ہوں اس سے اس نظم کی مخفیت کا پتہ چلتا ہے:

اک بے وفا کے نام
تیرے بھی دل میں ہوک سی اٹھے خدا کرے

بازدید“ کے اقتباس پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:
 ”دوراں صاحب کی شاعری کے ابتداء ۱۹۵۱ء سے ہوئی تھی۔
 شروع میں انہوں نے غریلیں لکھیں۔ غریلوں کے بعد نظموں کی طرف ملت فت
 ہوئے۔ لکھتے میں انہیں جیلِ مظہری اور پرویز شاہدی عیسے اپنے وقت کے اکابر
 لکھنے والوں کا ساتھ ملا۔ پرویز شاہدی سے دوراں صاحب کی ڈھنی قربت بھی
 رہی۔ ایک دو مرتبہ نمونہ نامہ کلام پر اصلاح بھی لیکن یہ سلسہ دراز نہ ہو سکا۔
 دوراں صاحب کی شاعریہ صلاحیتِ فطری ہی اور انہیں ہر یہ کسی راہبر کی ضرورت
 نہیں تھی۔ دوراں صاحب فطری مناظر سے متاثر ہونے والے شاعر تھے۔ ان
 کے شعری تحریرات پر ان کے مزاج کی آزادی روی بلکہ آوارہ خراہی نے گہرا اثر
 ڈالا تھا۔ وہ پچھے پچھے با غایہ اور اقلابی تیور کھنے والے شاعر تھے۔ ان کا شعری
 مزاج اگریزی کے رومنی شعرا سے متاثر تھا۔ یہ تمام عناصر دوراں
 صاحب کی بھجی شاعری کی بنیاد میں شامل ہیں۔ دوراں صاحب نے اپنی
 شاعری کے پورے دور میں نظیمین زیادہ لکھیں۔ غریلوں کم لکھیں۔ ان کی غریلوں
 اور نظموں پر ”مشتعل دو گمومے“ ”ملحوں کی آواز“ ۱۹۷۲ء اور ”بابیل“
 ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئے۔

دوراں صاحب عمر بھر ترقی پسند شاعر وادیب کی حیثیت سے جانے
 جاتے رہے۔ بلکہ ان کا اصرار تھا کہ ان کو ترقی پسند شاعر سمجھا جائے۔ لیکن جب
 ان کی نظموں اور غریلوں کا کھلی فضائیں مطالعہ کیا جاتا ہے تو بر ملا احساس ہوتا ہے
 کہ دوراں صاحب ذہن و فکر اور مزاج سے ترقی پسند رہے لیکن ان کی مشہور
 نظموں کے اظہار اور اسلوب پر کہہ بند ترقی پسندی کی مہر لگتے کہ جائے جدید
 اسلوب کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ راقمِ اسطورا ایک بے لالگ تقدیمی جائزے
 کی روشنی میں پہ بات ثابت کرنا چاہتا ہے کہ دوراں صاحب کرچڑتی پسند شاعر
 تھے لیکن ان کے نئی میں تابانی جدید اظہار و اسلوب کی وجہ سے پائی جاتی ہے۔ اور
 یہ جتنی اہم بات ہے اتنی ہی دوراں صاحب کے نقادوں کی نظر وہ سے پوشیدہ
 بھی رہی۔ ●●●

وہ لہو پی کر بڑے انداز سے کہتا ہے یہ
 غم کا ہر طوفان اس کے گھر کے باہر آئے گا
 ☆☆
 یہ سخن گلستان نہیں مقتل ہے رفیق!
 ہر شاخ ہے تکوار یہاں، جاگتے رہنا
 ☆☆
 پھر زیست کر ہے پھول سی مٹ جائے بلا سے
 بھجن سے مگر بر سر پیکار ہی رہئے
 پروفیسر اویس احمد دوراں کی موت اردو کی علمی وادی و نیا کے لئے
 ایک بڑا خسارہ ہے۔ ان کی موت سے در بحق، مغل اچل بلکہ پورے بہار کی
 سرزین غم کے ماحول میں ڈوب گئی ہے۔ ان کی موت سرزین بہار خاصل کر
 در بحق کے لئے ایک زرین باب کا خاتمه ہے۔
 جو کرتے ہیں ہمیں کو دارستہ تاریخ کو روشن
 زمانہ ایسے لوگوں کو ہمیشہ یاد کرتا ہے

پروفیسر اویس احمد دوراں مجھی تھیتی جنہوں نے اپنی زندگی
 خاکساری میں گزاری۔ اتنی بڑی شخصیت ہونے کے باوجود خود کو کرے میں بند
 رکھا۔ میں نے جب اردو کی طرف دیکھا تو مجھے پہلا انسان اویس احمد دوراں نظر
 آیا۔ ایک عرصہ تک میں ان کے ساتھ رہا۔ شروعاتی وقت میں میرے کلام کی
 اصلاح دوراں صاحب کیا کرتے تھے۔ میں نے جتنا وقت ان کے ساتھ گزارا
 ان کے اندر خاکساری پائی۔ اپنے ایک مضمون ”موجودہ نسل ایک جوان المعر
 شاعر۔ مصروف خوشی“ میں انہوں نے میرے متعلق لکھا:
 ”اپنے شاگرد شید مصروف خوشتر کی حمد، نعمت اور غزاں کے متعلق
 میں صرف اتنا کہوں گا کہ میرا یہ شاگرد ابھی شاعری کی دنیا میں نوار دھے۔ لیکن
 ہونہار بردا کے چکنے چکنے پات والا معاملہ ہے۔ آفتاب ابھی طلوع ہی ہوا ہے۔
 اس کو لباس فرکر کے نصف انہار تک پہنچنے ہی میں وقت لگتا۔ مگر کرنیں طلوع
 آفتاب کے بعد ہی اپنی تابنا کی سے افق کو منور کرنا شروع کر دیتی ہے۔ مسفلت
 میں کون کیا ہو گا اس کا علم سوائے خدا کے نہ مجھ کو ہے اور نہ آپ کو صرف خدام عالم
 الخیب ہے۔“

بیداروں کی دنیا کبھی لتی نہیں دوراں
 اک شمع لئے تم بھی یہاں جاگتے رہنا
 اپنی اولاد معمونی مصروف خوشتر کے لئے نیک تھنائیں اور دعا ایں۔
 اویس احمد دوراں کو ان کی زندگی میں ان کی خلمت کے شایان شان
 مقام عطا نہیں ہو سکا۔ ابھی کچھ ماہ قل بہار اور اکادمی نے اکادمی آپ تک سلسہ
 کے تحت انہیں اعزاز سے نوازا تھا۔ اویس احمد دوراں سچا خراج عقیدت اب ہمیں
 ہو سکتا ہے کہ ان کی خدمات کو زندہ کیا جائے۔ ان کی غیر مطبوع صیروں کی اشاعت
 ہو۔ اور ان کے فن کو یاد رکھا جائے
 آخر میں پروفیسر جمال اویسی کی کتاب ”اویس احمد دوراں: ایک

رات

اقبال حسن آزاد

اس نے ایک زور کی سانس لی۔ اسے اپنے اندر خالی پن کا احساس ہوا۔ ہر طرف سنا تھا۔ چیخ جاتا تھا۔ رات بالکل خاموش تھی۔ ایک خاموش تھی۔ قبرستان۔ کہیں کوئی آجست، کوئی آزاد نہیں۔ بیوں ہی دیوار سے فیک لگائے اسے اوگھا گئی۔ اب وہ سوتا تھا نہ جاتا تھا۔ سوتا تھا رہتا تھا۔ اس حال میں اگر کوئی اسے دیکھتا تو سمجھتا کی شاید وہ مر چکا ہے۔ لیکن وہ زندہ تھا۔ اسے جیرت ہوتی کہ وہ اب تک کیسے زندہ ہے۔ تین جوان بیٹوں کی لاش دیکھنے کے بعد بھی وہ زندہ تھا۔ گولیوں سے چھلنی اور خون سے سنی لاشیں۔ ان کے کوئی اور جوان جسم کے جان پڑے تھے۔ اور وہ قرار اُنھوں سے انیں دیکھ جا رہا تھا۔ اس کا جسم بھی کویا پتھر کا ہو چکا تھا۔ اس کے جذبات و احشات بھی پتھرا پچھتھے۔ وہ روتا جا رہتا تھا اگر اس کی آنکھوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ آنسوؤں کا جھرنا اندر ہی اندر بیٹیں بیٹکی ہو چکا تھا۔ وہ چھنپا جاتا تھا۔ اگر اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں لگتی۔ ساری آوازیں گھٹ کرہ گئیں تھیں۔ یہ باشیں تو کئی سال پر اپنی ہو جو گھنیں مگر ختم ہی بھرا تھا۔ ہی ان پر کھڑ جی تھی۔

کسی کے رونے کی آواز اس کی نیم و آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ کوئی پتھروں میں رو رہا تھا۔ شاید کوئی عورت تھی۔ شاید اس کی بیوی تھی۔..... اس کے بچوں کی ماں..... جو پتھکیاں لے کر درود ہیاں کہاں؟ وہ بھی اپنی قبر کے اندر آرام کر رہی تھی۔ یہ رونے کی آواز..... یہ پتھکیاں..... یہ دبی دبی سکیاں..... یہ سب اس کے اندر سے کل رہی تھیں۔ مبرکہ پیانہ لئے رینز ہو چکا تھا۔ ضبط ساری حدود کو توڑ کر باہر نکلے کو تھا۔ اس نے اپنی نانکیں سیدھی کیں اور پھر عکیل کرفٹ پر لیٹ گیا۔ پھر اس نے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا، آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

مرغ کی آواز اس کی آنکھ کھل گئی۔ دن چڑھا یا تھا اور دھوپ سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسے اپنے سارے جسم اکڑا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے ہاتھ پر ٹھیک کرائے سیدھا کرنے کی کوشش کی اور آٹھ کر بیٹھ رہا۔ اس کی زبان انشکری تھی اور منہ کیلما ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں کچھ کھڑا آئی تھی اور کمرے کے درود یا ورود ہندلار ہے تھے۔ اس نے اپنی ساری قوت بیکجا کی اور آٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر دھیرے قدموں سے چلتا ہوا بہر آمدے میں آگیا۔ سمجھی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ مگر آگن کھلا ہوا تھا۔ اس نے بالٹی میں رکھے پانی سے منہ پر پھینکیں باریں اور تو لیے سے چھڑے صاف کیا۔ اس کی بہو آگن میں اُنکڑوں پتھنی پتھنی کھڑک رہی تھی۔ اسی وقت اس کے کانوں میں کچھ کھٹ پت کی آواز آئی۔ آواز دمرے کمرے سے آرہی تھی۔ اس کے قدم بے اختصار اس طرف بڑھ گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کے چہرے پر اٹھیاں اور خوشی کی ایک ہلکی لہر دوڑ گئی۔

اس کا دس سالہ پوتا اس کی بندوق صاف کر رہا تھا۔ ●●●

رات بہت دیہی تھی۔ اتنی دیہی کہ اس پر کسی تیز دھار کے آئے سے شکاف تک نہ ڈالا جسکتا تھا۔ اسے ناخنوں سے لمبچا جا سکتا تھا۔ گولیوں کی ترتوڑا ہے۔ بھی اس پر بے اثر تھی۔ دو شیراؤں کی بلند ہوتی پیچیں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ سڑکوں پر بہتا ہوا خون بھی اس میں جذب ہوئے بغیر اس کے کناروں سے ڈھنکا جاتا تھا۔

رات کی اس سفا کی کوکہ کر ٹلی جواندہ ری اندر کانپ گیا۔ وہ زمین پر آٹزوں بیٹھا تھا۔ اسے اپنی رگ میں اندر ہیرا خون بن کر گردش کرتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے اندر باہر طرف اندر ہیرا اقمار روشن ایک ہلکی سی کرن بھی کہیں آس پاس دکھائی نہ دیتی تھی۔ اندر ہیرا اتنا گہرا اور گاڑھا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ تک بھجاتی نہ دیجاتا تھا۔

رات بالکل سیاہ تھی۔ اتنی سیاہ کہ کالے ناگ کی سیاہی بھی اس کے آگے بیچتھی۔ اسے اپنے قریب، بہت قریب ایک اوزار کر دی۔ وہ کم کر کوئے میں دیک گیا۔ پھنکار پھر سانی دی۔ اس نے دھیان سے آواز کیست کان لگایا۔ یہ پھنکار اس کے اندر سے آرہی تھی۔ ساپنے جیسے کئنی بار کراس کو دل کے اندر بیٹھ گیا تھا۔۔۔۔۔ خوف کا ساپن۔ وہ خوف زدہ تھا۔ صرف وہی نہیں بلکہ پوری وادی خوف زدہ تھی۔ اونچے اونچے برف پوش پہاڑ، گھنیمے پیڑ، جھیل میں بہتا ہوا پانی پہاڑ تک کھڑکاں میں چلتی ہوا بھی خوفزدہ تھی۔

رات بہت بیٹھی۔ اتنی بیٹھنا آسان یا سمندر کا کنارہ۔ چلتے جائے، چلتے جاؤ کنارا ملتا ہی نہیں۔ یہ مسافت کب ختم ہو گی۔ کنارا کب آئے گا؟ مزمل کب ملے گی؟ نہیں معلوم۔

رات بہت بھیا کیک تھی۔ اتنی بھیا کیک جیسے کوئی غفریت، کوئی بھوت، پر بیت یا مکھل پیری۔ ماں کہتی تھی، ”بیٹا! کیلے بن گلکوں میں نہ جایا کر کوئی مکھل پیری پیچھے پڑ جائے گی۔“ ماں کی پیدائشی اس کی بودھی آنکھوں کے گوشے بیگ گئے۔ اس جنت مکافی کو کیا معلوم کہ ہم کس دوزخ میں جل رہے ہیں۔ کیسے کیے غفریت، بھوت اور پر بیت ٹھکنیں لئے ہمارا ہبوجانے کے لئے سڑکوں پر ٹھوم رہے ہیں اور ہم مجبور، بے لب اور بے کس اول گھروں کے اندر بھوکے پیاسے کی روپیلی خیز کا انظار کر رہے ہیں۔ اسی چکلی اور پیاری صبح جب خوف کے بادل جھٹ جائیں گے اور ہم بھی آزاد ہواؤں کی طرح ان خوبصورت وادیوں میں مست خرام ہوں گے اور برف زاروں پر ہمارے پیچے کھلتے پھریں گے۔

جب موسم کی چہلی برف پاری ہوتی ہوئی تو اس کا پاپ خوشی سے چپکار بھرتے ہوئے کہتا۔ ”آہا! اب ہمیں ٹھیم گوشت کھانے کو ملے گا،“ اور وہ اپنے پاپ کے سرخ دسپید چہرے اور ہندی سے سرخ داڑھی کو اپنی چکلی آنکھوں سے دیکھتا۔ اس لی ماں کے سیب جیسے گال خوشی سے متمناً اور چھوٹی بہن کے مخصوص قہقہے ان کے چھوٹے سے گھر میں گونجتے۔

جوں مرگ اہل قلم

کلیات "ماہ قلم" کے عنوان سے ہے۔

آخر شیرانی

شاعر و مان کا خطاب پانے والے آخر شیرانی کا اصل نام محمد داؤد خان تھا۔ ان کے والد حافظ محمود شیرانی اردو کے نمایاں ترین محققین میں شامل ہیں۔ آخر شیرانی 4 مئی 1905 کو لونک (راجستان) میں پیدا ہوئے۔ رومانی اشعار کا یہ خالق لاہور میں 9 ستمبر 1948 کو وفات ہنسی سے جمالا۔

سعادت حسن منتو

اردو کے عظیم ترین افسانہ نگاروں میں شمار کیے جانے والے سعادت حسن منتو 11 مئی 1912 کو سرالہ (صلح لدھیانہ) میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں 18 جون 1955 کو بہتر سرائے جہاں سے آخری منزل کی طرف کوچ کیا۔ اسرار اخفیٰ جزاً اردو کے مقبول شاعر اسرار اخفیٰ مجاز زوالی (صلح بارہ بھنگی) میں 19 اکتوبر 1911 کو پیدا ہوئے۔ 5 دسمبر 1955 کو لکھنؤ میں رہی ملکہ عدم ہوئے۔ مجموعہ کلام "آہنگ" کے عنوان سے ہے۔

رشید چہاں

معروف خاتون کیونٹ لپڑ اور افسانہ نگار اکرم رشید چہاں (جنہیں بھض لوگ غلطی سے رشید چہاں بھی لکھتے ہیں) 25 اگست 1905 کو دہلی میں پیدا ہوئی۔ ان کے والد نویل شیری تھے۔ جب 1932 میں تمہلکہ خیز کتاب "انگارے" شائع ہوئی (جس پر پابندی الگادی تھی) تو اس میں رشید چہاں کا ایک افسانہ "تی کی سیر" اور ایک ڈراما "پورے کے پیچے" شامل تھا۔ رشید چہاں کا 29 جولائی 1952 کو اسکو میں انتقال ہو گیا جہاں وہ سرطان کے ملاج کے لیے گئی تھیں۔

ممتاز شیریں

ممتاز فقاد، مترجم اور افسانہ نگار ممتاز شیریں 12 ستمبر 1924 کو میسور میں پیدا ہوئیں۔ اپنے شوہر صمد شاہین کے ساتھ پاکستانی ادب اور منتو کی حمایت میں سرگرم رہیں۔ جنہیں ترقی پسندوں نے مطعون کرنا شروع کیا تھا۔ اسلام آباد میں 11 مارچ 1973 کو جان جال آفرین کے سپرد کی۔ بھکر یہ روز نامہ بندگ

دنیا کی ادبی تاریخ میں ایسے کئی ادبی اور شاعر گزرے ہیں جنہوں نے کم عمری میں نام کیا لیکن جلد ہی دارفانی سے حیات جاودا فی کی جانب گوچ کر گئے۔

آئیے اردو کے چند جوں مرگ اہل قلم کی زندگیوں اور ادبی کاموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

ٹکلیب جلالی

اردو کے معروف و مقبول شاعر ٹکلیب جلالی کا اصل نام سید حسن رضوی تھا۔ 1934 کو علی گڑھ کے قریب جلال ناہی ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ اس حاس شاہ نے 12 نومبر 1966 کو سرگودھا میں چلتی ہرین کے سامنے خود کو گرا کر موت کو گلے لگایا۔ مجموعہ کلام "روشنی اے روشنی" کے عنوان سے شائع ہوا، افسانہ بھی شائع ہو چکی ہے اور مختصر انتخاب کلام بھی۔

عبد الرحمن بخوری

غالب کے دیوان پر "محاسن کلام غالب" کے نام سے شاندار مقدمہ لکھ کر مشہور ہونے والے عبد الرحمن بخوری 10 جون 1885 کو سیدہارا (صلح بخور) میں پیدا ہوئے۔ بھوپال میں 7 نومبر 1918 کو داعی اہل ولیک کہا۔

مصطفیٰ زیدی

معروف شاعر سید مصطفیٰ حسین زیدی پہلے نعمت اللہ آبادی تھا۔ کرتے تھے اور بعد میں مصطفیٰ زیدی کے نام سے شاعری تھا۔ اللہ آباد میں 10 اکتوبر 1930 میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور مقابله کے امتحان میں کامیاب ہو کر اعلیٰ عہدوں پر رہے۔ 12 اکتوبر 1970 کو کراچی میں پر اسرار حالات میں سنگ آخونت پر روانہ ہو گئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مصطفیٰ زیدی نے خود کی تھیں۔

پروین شاکر

نسائی احساسات کو اردو شاعری میں منفرد انداز میں پیش کرنے والی ممتاز شاعرہ پروین شاکر 24 نومبر 1952ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ کم عمری ہی میں اپنی شاعری سے سب کو چونکا دیا اور اپنے پہلے شعری مجموعے "خوبیوں" کی اشاعت کے بعد مقبول ترین شعر میں شامل ہوئیں۔ 26 دسمبر 1994 کو اسلام آباد میں بریک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوئیں۔

شاذ تمکنت کی شاعری میں هجرو فراق کا پھلو

محمد زبیر

فکی ما جوں سے زیادہ رغبت نہ تھی اس لیے جلد ہی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ انہوں نے البتہ گانے اور توالیاں لکھیں۔

شاذ تمکنت کی شاعری میں تھائی کا احساس جا بجا ملتا ہے۔ انسان کی زندگی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ بچپن میں سب کا پیار محبت، نازوں، مرگشیاں اور ہر طرح کی عیش پرستیاں جوانی اور خود کی نالات کی صبح ہوتے ہی روپیں ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ معاشر پریشانوں اور سخیجی گیوں کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ انسان کو محبوں سے آتا ہے محبوں کی رہتی ہے اور بھی بھار جلوٹ میں ہوتے ہوئے بھی خلوٹ و تھائی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس شاید اس لیے ہوتا ہے کہ انسان اپنی خوشیوں اور غموں میں اتنا مصروف ہو جاتا ہے کہ دوسروں کی خوشی اور گنگی کا احساس ہی نہیں رہتا۔ ایسے میں ایک عام انسان کے پہکن ایک شاعر یا ادیب جو زیادہ حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے اپنے داخلی کرب کر زینت قرطاس بنانے کی کوشش میں لگ چاتا ہے۔ شاذ تمکنت کی شاعری میں انکی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں جہاں ان کا احساس تھائی واضح دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظم نغموں کی سمجھی سے چنانچہ لاحظہ فرمائیں۔

سوچتا ہوں کہ میتے ہوئے روز و شب
کیوں تھے اک عمر تک تسلیم طلب
زندگی اجھی اور موت بھی اجھی
میں نے کائے ہیں ایسے شب و روز بھی
صح کی کئی شام کی لبری
رفتہ رفتہ یہ دوست بھی لیتی گئی
محبت اکھنوں کی زخمی بچ چمن گئی

خواب کی دیوی فتنگ لگائی رہی
دل بُو لے ک صورت بھکڑا رہا

تھائی کے حوالے سے ایک اور قلم کے یہ اشعار بھی لاحظہ فرمائیں

میری آواز میں تھا لوٹی راتوں کا ساثا
میرے لمحے میں جیسے کھل رہی تھی میری تھائی

گھشتہ ہو رہی تھی خوبی پہنچنے کی
معانی تھے سر بام جن گویا تھائی

بھرو فراق کو شاعری میں خوب برتائیا ہے۔ اس کرب میں گزرے
لحاظات اور لمل و نہار کو شعرا نے اپنے انداز میں اپنی نظریہ اور غزلیہ شاعری میں
پیش کیا ہے۔ شاذ تمکنت کی شاعری میں بھرو فراق پر لکھے گئے اشعار کی بھرمار ہے

سر زمین میں دکن کو ادبی اعتبار سے ابتداء ہی سے اولیت حاصل رہی ہے۔ اس سر زمین نے ایسے ایسے علماء اور شعراء کو حجم دیا ہے جن کی تحقیقات کی رونق نے چاروں سمت پھیل کر کر گناہوں ادنی چالغ روشن کرنے کا کام کیا۔ اردو مشعر کے قدیم مشوی قدم را تو پر ادا، پہلا صاحب دیوان شاعری قلب شاہ، پھیل داستان سب رس وغیرہ تمام کا لعل دکن کی زرخیز سر زمین سے ہے۔ اردو ادب کی اکثر و پیش اضاف پر سب سے پہلے دکن میں ہی طبع آرڈائی کی گئی۔ بھی جب ہے کہ دکنی ادب کواردو ادب کا بنیادی اناش سمجھا جاتا ہے۔ بیان کے ادبی اور شعری اپنی ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ شاذ تمکنت کا شمار بھی ان ہی عالمی شہرت یافتہ شعرائیں ایک خاص مقام کا حامل ہے۔

نام سید حیث الدین تھا جبکہ خاندان والوں اور عامت جانے والوں میں وہ شفیع بھائی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ شاذ تمکنت فہی نام اختیار کیا۔ 21 جنوری 1933ء میں حیدر آباد کوئی میں بیدا ہوئے اور 18 اگست 1985ء میں حیدر آباد میں ہی انتقال کر گئے۔ شاذ تمکنت کے والد کا نام سید حیث الدین اور والدہ کا نام جلالی بیگم تھا۔ سید حیث الدین نظام حیدر آباد کی جاندار ادویں کے شعبہ صرف خاص میں تھے اور 1942ء میں ان کا انتقال ہوا۔ شاذ تمکنت کی والدہ ما جدہ صرف جاپیں برس کی عمر میں ماہ رمضان میں روزے کی حالت میں انتقال کر گئی۔ شاذ تمکنت نے عثمانی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ بیس سے پہلی ایج ڈی کی ذرگی حاصل کی۔ شعبہ اردو جامعہ ٹھانیہ میں ہی درس و تدریس کے پیشے سے مسلک ہوئے۔

شاذ تمکنت کی شاعری کا آغاز صرف چودہ برس کی عمر میں ہوا۔ وہ ابھی چودہ برس کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوا گی۔ اس صدمے کے بعد ہی ان کی شاعری کی شروعات ہوئی۔ بیس سال کی عمر میں انہوں نے فراق گوکھپوری کی موجودگی میں ایک بڑے مشارعے میں نظم پڑی۔ 35 سال کی عمر میں ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد کر کھشنی شاذ منیا گیا جس میں ان کے معاصر شعراء اور احباب نے شرکت فرمائی جن میں تھی عظی، جانثار اختر وغیرہ شامل تھے۔ یہ جانکاری دکن کروئیں اور روز نامہ سیاست سے لی گئی ہے)

شاذ تمکنت کا ہبہ شعری مجھے ”ترائیڈہ“ کے نام سے 1966ء میں شائع ہوا۔ دوسرا شعری مجموعہ پیاض شام، 1973ء تیرا شعری مجموعہ ”شم خواب“ 1977ء اور چوتھا شعری مجموعہ ”دستِ فرہاد“ کے نام سے 1994ء میں ان کی وفات کے تقریباً نو سال بعد شائع ہوا۔ علاوہ ازیں درج کے نام سے ان کے کلام کا ایک انتخاب بھی شائع ہوا ہے۔ ان کا پی ایج ڈی کا مقالہ بھی ان کی وفات کے بعد چھپ کر مظہرعام پر آچکا ہے۔ شاذ قلم اندھڑی میں بھی گئے لیکن چونکہ

میرا روڈ، تھانے

سماں

ادب گاؤں

۵۰ روپے

ترتیب و تهذیب

اشتیاق سعید

9930211461

ملبیری کے آس پاس

شاعر: عطاء الرحمن طارق

ایڈشัٹ پبلیکیشنز، ممبئی

خوبصورتے کے حوالے سے

شاعر و ناشر: بدرا محمدی

نو جوان شاعر، حافظ و قاری ناظم اشرف کا شعری مجموعہ

شاعری تک آگئے

سنہ اشاعت: ۲۰۱۹ء

جہاں ان کا ذاتی غم کائنات کے غم کی صورت میں جلوہ گرتا ہے۔ ویسے بھی شاذِ غم ذات کو غم کائنات سے الگ نہیں مانتے۔ وہ اس تعلق سے اپنے شعری مجموعے "تراسیدہ" کے پیش لفظ بعنوان "لطفِ خلش پیکان" میں لکھتے ہیں۔

"یہ چند نظریں اور غزلیں جو آپ کی نظر وہیں کے آگے ہیں، میرے ماحول کی دلائل اور خارجی کیفیات سے لودے رہی ہیں۔ یہ شعرِ غم ذات اور غم کائنات کی شاعرانہ تفسیریں ہیں۔ میں غم ذات اور غم کائنات کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں نہیں باشش، بلکہ میری دانست میں غم ذات عبارت ہوتا ہے غم کائنات سے۔ ایک فرد کا غم اس کا اپنا ہوتے ہوئے بھی درپرده افراد کے دکھ کہ کی ترجیحی کرتا ہے۔"

(لطفِ خلش پیکان، مشورہ کلیات شاذ، ابجوہ یونیشن پیشگفتہ، ہاؤس نی دہلی، ص 27)

شاذِ غم ایک خرل کے پڑا شعار، میں

سن کر بیان دروکیج وہاں نہ جائے
دنیا سے ڈر رہے تھے کہ دنیا بدل نہ جائے
ہر چھلٹ نشاط سے پھرتا ہوں دو در دو
کیا اختیاط ہے کہ تر غم بیل نہ جائے
ہیں طاقت آرزو پر کھلونے بجے ہوئے
ماں اس آرزو کی طبیعت میں نہ جائے
تشہی لیں مجھے غرقاب کرندے
تصوڑی اسی روشنی کے لیے گھری بیل نہ جائے
روؤں کی ماں کر راحت خلوت نہیں ہے شاذ
ہنسنے پر بھی یہ شرط کہ آن لوکل نہ جائے

شاذِ تمنکت کی شاعری کے اس سرسری جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں انہوں نے اپنی شاعری میں گوناگون موضوعات پیش کیے ہیں وہاں ان کے کلام میں بھروسہ اور تھائی کے کرب کو بھی بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ اُسیں لفظوں کے اختیاب اور ان کے صحیح استعمال پر تقدیر حاصل ہے۔ وہ جہاں شاعری میں سیدھے سادے اور دل میں اتنے والے مصروف لکھتے ہیں وہیں ان کی شاعری میں چیل کی بلند پروازیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ان کی شخصیت اور کارناموں پر جس قدر کام ہوتا چاہیے تم اس قدر نہیں ہوا۔ اہل علم و دانش کو اس طرف دھیان دیتے کی ضرورت ہے۔

حوالی

1 دکن کرونیکل، 31 جنوری 2017ء

2 مجتبی حسین، یاد رفیگان شاذِ تمنکت، میرا کالم، روزنامہ سیاست، 10 جولائی 2016ء

3 مجتبی حسین، یاد رفیگان شاذِ تمنکت، میرا کالم، روزنامہ سیاست، 13 جولائی 2016ء

4 ڈاکٹر علیم احمد یاد رفیگان شاذِ تمنکت، ادبی ڈائری، روزنامہ سیاست، 13 اگست 2016ء

5 شاذِ تمنکت، آزاد دائرۃ المعارف، وکیپیڈیا

6 کلیات شاذ، ابجوہ یونیشن پیشگفتہ، ہاؤس نی دہلی، 2004ء



پروین شاکر کی شاعری کے مختلف رنگ

فهمینہ علی

انداز کا استعمال کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ فقاد ان کی شاعری کا موازنہ ”فروغ فرخزاد“ جو کہ ایک ایرانی شاعر ہیں، کی شاعری سے کرتے ہیں۔ آپ کی زندگی خاص طور پر ازدواجی زندگی کی ناکامیوں نے آپ کے کلام میں جگہ جگہ اپنا اثر دھایا ہے۔ پروین شاکر نے تسلیم کیا تھا کہ ”محبت ان کی شاعری کا مرکز ہے لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے اور مشاہدات کی نووت بدقی جاتی ہے تو محبت کا استھانہ سارے معاشرے، لیکن بلکہ ساری دنیا کو اپنی معموقی تھوڑی میں سیست لیتا ہے۔“

ہمارے ادب کی یا یوں کہیں کہ معاشرے کی پرانی روایت تمی کر مستورات کو اپنے جذبات کا اطمینان کرنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ اگر کوئی اس اثناء میں قدما بڑھاتا تو اسے غیرتی کی علامت بھاجاتا تھا لیکن آپ نے اس کی روایت کھنچنی بھر پور انداز میں کی۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام باتیں اشارے و کتابیہ میں اس انداز سے برقراری ہیں کہ ان میں نسوانیت کی پاسداری کہیں بھی مجرور نہیں ہوتی۔ مثلاً،

وہ چند بنوں کے میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اس کی بھر کر راتوں میں اکبِ لکھنی

میں تیرانام لے کے تربزب میں پڑ گئی
سب اپنے اپنے چانپے والوں میں گھوگھے

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لا جواب کر دے گا

کو کچھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پڑیاں کی

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پر جب ہاتھ رکھا
روح تک آگئی تاشیر میجانی کی
جانے کب تک تیری تصویر گاہوں میں رہی
ہو گئی رات تیرے گلکس کو سکلتے تکتے
میں نے پھر تیرے تصویر کے کی لمحے میں
تیری تصویر پر لب رکھ دے آہستے
عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ پروین شاکر کی شاعری نسوانی جذبات

اردو شاعری کی تاریخ میں چہاں ایک جانب نہایت بلند و بالا شروع کا تھاون رہا ہے وہیں دوسری طرف خوتمن کی ادبی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری شاعری کے پایہت جب بھی کی ادبی محفل میں ذکر ہوتا ہے تو لوگ میر غالب، فراق اور اقبال تک محروم نظر آتے ہیں۔ لیکن ان سب بڑے ناموں کے درمیان کچھ ایسی جسماتیں بھی ہیں جن کا ذکر کئے جانا یہ تاریخ ناکمل ہے۔ مردوں کا ذکر اپنی جگہ لیکن مستورات بھی وجہے نہیں ہیں ایسیں میں ایک اہم نام ہے پروین شاکر کا۔ پروین شاکر جدید شاعرات میں ایسا نامیاں مقام رکھتی ہیں۔ پروین شاکر نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آرمائی کی لیکن خیادی طور پر وہ غزل کی شاعرہ ہیں اور اردو شاعری کے لئے آپ ایک انسانی شاعری کی عالمت ہیں۔ اردو شاعری میں مختلف رنگ و آہنگ کی شاعری کی جاتی رہی ہے لیکن اپنا مقام صرف انھوں نے بھاپے جھوٹوں میں اپنا منفرد لاب و لبجا بیجا کیا۔ پروین شاکر کا اپنا شخصیوں انداز تھن ایسیں سب سے مفرد بناتا ہے ان کی شاعری کا نفسیاتی پہلو بے حد پراڑ ہے جو کہ قاری پر جادو کا سائز کرتا ہے۔ آپ کی شاعری میں زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ ساتھ ایک غیرت مندرجہ کی زندگی کی سکھش کی عکاسی صاف۔ بھی جا سکتی ہے۔ ایک طرف جہاں غزل برتنے میں آپ اپنا ہانی نہیں رکھتی وہیں دوسری طرف آپ کی نازک خیالی بھی بے جوڑ ہے۔ آپ کی شاعری میں جدیدیت کا عصر بھی قدامت کی پاسداری کے ساتھ موجود ہے۔ آپ اردو کی بھلی ایسی شاعرہ ہیں جھوٹوں نے جھوٹی بار اردو ادب کو نسوانی شاعری کے نفسیاتی مضامین سے روشناس کرایا۔ زندگی کی جدوجہد میں اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو جھاتے ہوئے آپ نے بہت خدمت کی۔ آپ نے انسانی جذبات کو اپنی شاعری میں نہایت وافریب انداز میں پیش کیا ہے۔ محبت، درد، تہائی اور فراق وصال سے لبریز آپ کا شعری مجموعہ ”خوبیوں“ میزرا عالم پر آیا تو آپ کے الفاظ کی مہک چہار سوچھی اور جس نے اندروں دیرون ملکوں میں بے پناہ شہرت حاصل کی۔ اس کتاب پر ایسیں ”آدم جی، ابوارڈ“ سے بھی نوازا گیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کے دیگر مجموعے جن میں ”صد بُرگ“، ”مسکراہٹ“، ”چبیوں کی چکار اور اف آئینہ“، ”خود کلامی“، ”اکار“ اور ”اہ تمام“ نے آپ کا اردو شعراء کی صفت میں ایک قد آرڈ شاعرہ کی حیثیت سے کھڑا کر دیا۔

پروین شاکر کی غزلوں نے اردو شاعری میں کسی نرم جھونکے کا ساٹھ دکھایا۔ الفاظ کا اختبا اور لمحہ کی لکھتی نے آپ کو متعدد اعماق شاعرہ بنا دیا۔ انھوں نے ”غیر ملکم“ (صف نازک) کا صیغہ استعمال کیا جو شاعری کی دنیا میں خواتین کے جذبات کا ترجمان ہا۔ آپ نے نسوانی جذبات کے برتنے میں جس مختبر

حافت نہیں۔ جسے آپ نے ایک عمدہ استعارے کے ساتھ بیٹھ کیا ہے۔

ہاتھ تو کاث دئے کوڑہ گروں کے ہم نے
محجرے کی وہ ہی امید کر جا کے ہے۔

آپ کی حب الٰہی کام میں جا پانظر آتی ہے۔ انھیں تھک جائیں

بھی اپنے ڈن سے اتنی بی محنت ہے کہ وہ اس پر اپنی جان اور دل دونوں فدرا کر

سکتی ہیں۔ ان کی صرفت کی انجماں بات سے وابستہ ہے کہ ان کا رشتہ ان کے

ڈن کی مٹی سے جڑا ہو ہے۔ مثال کے طور پر،

جنست سے کوئی نہایت ہے نہ افالاک سے ہے

یہی کام ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے۔

ملک کی سیاست سے واقفیت رکھتے ہوئے ہی وہ امید کا دامن اور بیکی کا

درس دینا ترک نہیں کرتی۔ انھیں اپنے راجہنماء (ہماری سیاسی یا ذاتی) کی

صلاحیت پر پورا اختیار ہے۔ انھیں امید ہے کہ ہمارا راجہنماء کم از کم ہماری تہذیب

کو بخوبی کر کے چون کی آرائش نہیں کرے گا، جس کا اعلیٰ رہان کے اس شعر سے

ہوتا ہے،

خوبصورت کر کے نہ لائے چمن میں رنگ

اتی تو سمجھ بوجھیں سے باخیں میں ہے۔

گردش دوراں کی گرفت میں آنے کے بعد حساس انسان کا ٹوٹ جانا بہت

حد تک ممکن ہوتا ہے لیکن مشکل دورے گزرنے کے بعد جگہ بات کا بیش قیمت

سرمایہ بھی انسان کو حاصل ہوتا ہے جس کے لئے گردش دوراں کا احسان مند، ہر کو

صرفت کا اظہار لازمی ہے۔ پودین شاکر کا زندگی کو دیکھنے کا یہ نظریہ ان کی شخصیت

کی حوصلہ مندی کی عمدہ نظریہ ہے۔ مثلاً،

ائے گردش دوراں تیرے احسان بہت ہیں۔

کچھ دیرمیر ساتھ بھی اب رقص کیا جائے۔

سو بھر کا دقار اس بات مختصر ہے کہ دل مسلسل نالہ شر ہے۔ اس کا رکرداری

میں غفلت کی گباش قلمی نہیں ہے کیوں کہ غفلت کا دوسرا مطلب ہے دل سے بھر

کا غم کہو گیا ہے۔ مثلاً،

گئی تھی تیری چھٹے پہر آنکھاے دل!

آج سے تم تیرے نالے سے اڑ کھیتے ہیں۔

آپ کے کلام میں حالات حاضرہ کی عام روشن اور اس کے الیکا بھی بیان

لاتا ہے۔ یہ لوگوں کی نئی کا یہ عالم ہے کہ دوستوں کی وفا پرستی پر اس قدر مگاں

ہے کہ ایک دشمنوں کے ساتھ کر کر اڑاں کے لئے آزاد چوڑ دیا گیا ہے،

دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں

دیکھنا ہے کہ پتھر ہے مجھ پہلا تیر کوں۔

پودین شاکر کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا صاف پہچانا ہے

کہ ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف انسانی زندگی اور خاص طور سے

مستورات کی زندگی کے نفیاتی اور ہزار باتی پہلو خوبصورتی سے نلم یہے گئے

ہیں، وہیں دوسرا جانب رنگ صوف، تنزل، سیاست، مہاج، اور فلسفے کے ساتھ

ساتھ ہی حب الٰہی کے مضمونیں نہایت خوش اسلوبی سے منظم یہے گئے ہیں

، احساسات اور فضیلت کی آئینہ دار ہے لیکن ان کی شاعری میں شاعری کے

دوسرے رنگ بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں وہ صرف ایک راوے یا رنگ کی

شاعرہ نہیں ہیں بلکہ بہت سے مختلف نظریات و خیالات ان کے بیان گردش

کرتے دیکھے جاسکتے ہیں اب تم آپ کی شاعری کے مختلف رنگوں کا جائزہ آپ

خواب میں بھی تجھے بھولوں تو روا رکھ محسسے

وہ رویہ جو ہوا کا خش و خاشک سے ہے

اس شعر میں پہلے وقت عشق حقیقی اور عشق بیجا زی کا خیال و لحاظ رکھتے

ہوئے مضمون کی ادا بھی کی گئی ہے۔ اگر جمیوں دنیاوی تسلیم کیا جائے تو محنت اپنے

ایشور و دفا کا اعلیٰ رہ پہنچے خواب میں ہی بھوئے کی کوشش

کروں یا تجھے سے غافل ہو جاؤں تو تجھے بیت یہی کہ تو میرے ساتھ وہ رویہ اختیار

کر جو ہوا خاک و بکھلوں کے ساتھ اختیار کرتی ہے، انھیں ازا کر منتشر کر دیتی

ہے۔ اس کے برکش اگر صحوب حقیقی سمجھا جائے تو بندہ اپنے رب سے دعا نو نظر آتا

ہے کہ اگر وہ اپنے رب کی یاد سے زراسا بھی غافل ہو تو خدا اس کی زندگی کا شیرازہ

اس طرح بکھر دے جس طرح ہوا خاک و بکھلوں کو بکھر دی ہے۔ اسی سلسلے میں

بزم انجم میں قباء خاک کی پہنچی میں نے

اور میری ساری فضیلت اسی پوشک سے ہے

اس شعر کو پہلی نظر میں پڑھنے کے بعد قاری کا ذہن جہاں تک جائے گا

وہ یہ کہ نہایت پروقارلوں کے درمیان میں نے اپنی افسوسی کا دامن بیس چھوڑا

لیکن اگر شعر کے مضمون کی گہرائی و گیرائی پر نظر ڈالی جائے تو آپ کی قوت مخلیہ کا

پتہ ملتا ہے یعنی کائنات میں موجود مخلوقات (نوری، ناری، ونکی) میں نوری

مخلوق کی بزم بزم انجم (یہ لفظ یہاں بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے) کے

درمیان میں نے خود کو خاکی پایا۔ انسان سے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ انسان

”اشرف المخلوقات“ ہے، یعنی نوری مخلوق کی بزم میں خاکی کی موجودگی اس کے

بلند ہونے کا پتہ دیتی ہے جو کہ شاعرہ کی عمدہ تھن وری کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ اسی

طریقے:

اتی روشن ہے تیری صبح کہوتا ہے گماں

یہ جالا تو کسی دیدہ منناک سے ہے

اوپر درج کئے گئے شعر کی آفاقیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا

ہے کہ شعر کی شعربیت کا حامل لفظ ”دیدہ منناک“ میں مضمون کی روح پہنچا

ہے۔ شعر میں صبح اور روشن دل، کاموازن دس خوبصورتی سے کیا گیا ہے کہ شعر کا

حسن دو بالا ہو گیا ہے۔ اٹکنے دامت کے روؤں ہونے کے بعد، کدورت صاف

ہو جانے پر دل آئینے کی طرح یہاں روشن ہے کہ جیسے صبح روشن ہوتی ہے۔

پودین شاکر کی شاعری میں جہاں ایک جانب آفاقیت، عشق حقیقی کی

علاقوں، اور مضمون کی گہرائی ہے وہیں اس میں دنیا کی عام روشن کا ذکر بھی بڑے

موڑ انداز میں پایا جاتا ہے۔ معاشرے میں جد جدد کرنے والے فنکار کا الیہ یہ

ہے کہ اس سے اس کے فن کی ساری اہمیت پھیلن لی گئی ہیں اور پھر اس سے یہ

امید کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرے، یہ آج کے دور میں کسی مجرمہ کی امید سے کم

غزل

افروز عالم، دُبئی

اٹک رخسار کو ڈھوتا تو سخنور ہوتا
میں سلیتے سے جو روتا تو سخنور ہوتا
ہم جرت میں بھی رقصان تھی جھٹری اٹکوں کی
اپنے دامن کو بھگوتا تو سخنور ہوتا
ڈوبتے مش کے ہونوں سے ظفر خاہ تھی
اس نبسم کو بجوتا تو سخنور ہوتا
دشت تھائی میں یہ انگلیاں کچھ دیر اپنی
خون دل میں جو ڈیتا تو سخنور ہوتا
دیر تک چاندنی ساہل پر تھی رقصان افسوس
میں دین جھیل پر ہوتا تو سخنور ہوتا
میرے احساس نے سینے سے نچوڑا ہے عرق
ان کو لفظوں میں پر ڈھوتا تو سخنور ہوتا
وادی جس میں اکٹھی تھی فضا کی سائیں
لفظ قرطاس پر ہوتا تو سخنور ہوتا
جائے والوں نے عالم کو بدلتا ہے
میں ذرا دیر نہ سوتا تو سخنور ہوتا

انقشیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروین شاکر ایک "ملی ڈا متشل"، فکری مالک ہیں۔
جدید شاعری چونکہ اپنے عہد کا سامنا کرنے اور اسے قائم خطرات اور امکانات
کے ساتھ برتنے کا نام رہی ہے اسی سبب اس جدیدیت نے پروین شاکر کی
شاعری میں بھی جگہ جگہ اپنارنگ دکھلایا ہے اس میں آپ کی کوہنہ مشقی بھی قابل
توصیف ہے، آپ کے مجموعہ "ماہ تام" کے چند اشعار،
ہمیں بہت ہے یہ سادات عشق کی نسبت
کہ قبیلہ کوئی ایسا ہم نسب بھی نہیں۔
ممثل سے آنے والی ہواں بھی کب ملا

ایسا کوئی دریچ کہ جو بے صلیب تھا۔
پیدکھنیں کہ اندرھروں سے صلح کی ہم نے
مالاں یہ ہے کہ اب ٹھنچ کی طلب بھی نہیں۔
آمد پر تیری عطا و چانغ و سیونہ ہو
اتنا بھی بودو باش کر سادہ نہیں کیا۔
مسئلہ جب بھی چاغوں کا اٹھا
فیصلہ صرف ہوا کرتی ہے۔
وہ خوف ہے کہ مر شام کھر سے چلنے وقت
گلی کا دوستک جائزہ ضروری ہے۔

محبت کو خوشبو کے شعری پیرائے میں سمونے والی یہ شاعری جس کا
سازمانہ انداز اور طلیف جزبات کا بہترین برداشت شاعری کی دنیا میں امر بناتا
ہے اس کی دستخط کے بغیر جدید پیشہ شاعری کا مظہر نامہ ادھورا ہے۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو
پروین شاکر کی کارائیکیڈنٹ میں ناگہانی موت نے شاعری کی دنیا میں ایسا خلاء
ڈالا جسے بھی پرنسپل کیا جا سکتا۔ ان کی وفات سے چند روز بھلی ہی "فون" میں ان
کا یہ شعر شائع ہوا تھا،

تیرے پیانے میں گردش نہیں باقی ساقی
اور تیری بزم سے اب کوئی اٹھا جاتا ہے۔
ایسا لگتا ہے مجھے اس نظموں کی شہزادی کو اس ملوفہ بیب کی دنیا سے حد رجہ
بے زارت ہو جکی تھی۔ کچھ شخصیات حقیقتہ صرف جسمانی موت مری ہیں ان کی
روح ہمیشہ ان کے الفاظ میں زندہ رہتی ہے، پروین شاکر اپنی شخصیات میں سے
ایک ہیں یہ خوشبو کی وہ شاعرہ ہیں جن کے الفاظ ان کے وصال کے اتنے عرصہ
بعد بھی اپنی ہتری میں ان کے ہونے کی گواہی دے رہے ہیں،
مر بھی جاں تو کہاں لوگ بھلاہی دیں گے
لفظ میرے ہمراے ہونے کی گواہی دیں گے

● ●

ایک شاعر ایک شعر

پہلے ہی سے جبیب تھے اک دوسرے کے ہم
ان الفتوں میں غیر کا احسان نہیں ہے یار
دانش اللہ آبادی
اُسے پتہ ہے مقدر ہے ہارنا اُس کا
مرا حریف مجھے پھر بھی آزماتا ہے
کوثر مظہری

8512813432

یہ ساری روشنی حیدر ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جونور خاک میں ہے
حیدر قریشی
کھلی نہ مجھ پہ بھی دیوانگی مری برسوں
مرے جنون کی شہرت ترے بیاں سے ہوئی
فراغ رو ہوی

اباجی اور امی جی

تصنیف و تالیف حیدر قریشی

حیات مبارکہ حیدر

تصنیف و تالیف حیدر قریشی

دونوں کتب کی پی ڈی ایف فائلز انک سے ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہیں

<http://my27books.blogspot.com/>

حیدر قریشی کی کتب تک رسائی اور حیدر قریشی متعلق ہونے والے کامنز

رسائی کے لیے تین اہم اور آسان بلاگس حیدر قریشی کی تمام کتابیں الگ الگ

صورت میں:

<http://my27books.blogspot.d/>

حیدر قریشی کی تمام کتابیں پانچ کلیات کی صورت میں:

<http://kuliat-library.blogspot.de/>

اس انک پر حیدر قریشی پڑھی گئی، مرتب کی گئی کتب و رسائل کی پی ڈی ایف فائلز موجود ہیں

<http://work-on-haiderqureshi.blogspot.com>

کتابی سلسلہ استفسار بے پرو

فی شمارہ ۵۷ روپے

زرسالانہ ۳۰۰ روپے

پانچ سال کے لیے ۳۰۰ روپے

تاتھیات ۵۰۰ روپے

مدیران

شین کاف نظام

9414136313

عادل رضا منصوري

9829088001

اقبال مجید کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تجزیاتی جائزہ

شاهدہ شفیق

جلیانی پاٹو، بلوٹ سکنگ، قاضی عبدالستار، اور سجاد، خالدہ حسین، بدرج میں را اور سرپرید پکاش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اقبال مجید نے جس انتخاب سے افسانوی دنیا میں اپنے کارناٹے انجام دیے وہ کہیں نہیں۔ اقبال مجید کو ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں سے منفرد ہوتے ہیں کیونکہ ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں نے افسانوی دنیا میں اپنے افسانوں کے ذریعہ تحقیقت کاری کی اچھی مثالیں پیش کی ہیں۔ مگر جلیانی پاٹو نے قسمی ہندسے متاثر ہو کر افسانوی ادب کو کی، ہترین افسانے دیے تو بولتے سمجھتے بخوبی کی تحقیقت کاری کا پی افسانوں میں نکرتے ہیں۔ جو گندر پالے اپنی زندگی کا برا حصہ افریقہ میں برکی اسی سبب انہوں نے کسانوں، مزدوروں اور محنت کش عورتوں سے متاثر ہو کر بہت پچھ لکھا۔ عادی سہیل نے انسانی رشتہوں کی تحقیقت کو پیش کیا۔ اور قاضی عبدالستار نے پریم چندی طرح تحقیقت کاری کے روایج کو قرار صنیکی کوشش کی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے چند نے غریب سماں ول، مزدوروں اور پچھلے طبقے کے حق میں لکھا جب کہ قاضی عبدالستار نے قسمی ہندسے بعد کے زمینداروں کی سپری اور بدلتی ہوئی قدروں پر قلم اٹھایا ہے۔ ان تمام اہم افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ اقبال مجید کے افسانے ایک الگ پڑاؤ کی نمائندگی کرتے ہیں مگر ان کے افسانوں میں روانیت بھی ہے، تحقیقت بھی ہے اور غصیات بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ نظریاتی طریقہ کی نظر آتی ہے۔ ان تمام ہاتھوں کو مد نظر رکھیں اور ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال مجید ہر طرح کی کہانی تختیکرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے ہٹ کر نظر آتے ہیں۔ پہلے افسانے عہد پچھا سے لے کر اب تک اقبال مجید نے جتنی بھی افسانے لکھے اس دو دن ان کے نام کی تحریروں میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ ”عہد پر فیض“، ”تماشا گھر“، ”تماشا گھر“، ”دو بیکے ہوئے لوگ“، ”ایک حلیہ بیان“، ان کی افسانہ نگاری کے مختلف ادوار کی عکاسی کرتے ہیں۔

اقبال مجید کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں کسی تمکی مہماںت اور کیسانیت نہیں ہوئی۔ ان کی تمام کہانیاں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوئی ہیں۔ ہر کہانی کا اپنا ایک الگ پیٹریون ہوتا ہے، یہاں تک کہ ان کی کہانیوں کے موضوع اور سلوب بیان میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان کے افسانوں کے عنوان میں ہی افسانوں کا موضوع پیشیدہ ہوتا ہے۔ اقبال مجید اپنے عہد کے تماجی اور زیادہ تر اپنے طبقے کے متعلق افسانوں کی سماںی، سیاسی اور شاخی محدودیوں کی سرگزشت کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ اس میں ”ٹوٹی چنی“، ”مد و چا“، ایک دن ایک رات، ”پیٹ کا کچوا“ اور بے سہارا، ”قابل ذکر افسانے میں جو سماجی تحقیقت، معاشرتی بے گی اور شاخی محدودیوں کو پیش کرتے ہیں۔

اقبال مجید کے افسانوں کا پلاٹ ان کے قرب و جوار کے سیاہی، سماجی اور شاخی سے متاثر نظر آتا ہے جیسے واقعات کے مطابق کی ان کو ترتیب دیا گیا ہے۔ جہاں ان کے پیشتر افسانوں پلاٹ لٹھے ہوئے اور مریبوط و کھائی دیتے ہیں وہیں کچھ افسانوں

اقبال مجید ۱۹۳۲ء کو مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالحید اور والدہ کا نام احمدی کا سلسلہ لکھنؤ سے شروع ہوا۔ انہوں نے ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ پر نوریتی سے بی۔ اے کا اختجان پاس کیا اور ۱۹۵۷ء میں علیگڑھ مسلم پر نوریتی سے بی۔ ایڈیکی ڈگری حاصل کی ۱۹۵۹ء میں اپنی پسند سے شادی کی۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۵ء تک گورمنٹ کالج اوری جا لون کے حکمہ تعلیم سے ملکے رہے، اسی درمیان ۱۹۶۹ء میں کانپر پر نوریتی سے سیاست میں اپنے اے کا اختجان پاس کیا۔ ۱۹۷۵ء تک ۱۹۷۴ء میں اسٹینٹ ڈائرکٹر ائمیار پریڈ یونیورسٹی میں پڑا ڈیسرپر کام رہے پھر ۱۹۹۰ء میں اسٹینٹ ڈائرکٹر ہو گئے اور ۱۹۹۱ء میں ملازمت سے سکدوش ہوئے۔ جھٹی دہائی کے نومرا فسانہ نگار ول کی جو پیری ہی سامنے آئی اس میں اقبال مجید کو ممتاز مقام حاصل ہے۔

اقبال مجید کو اسی دنیوں پر دسترس حاصل ہے لیکن فنی انتبار سے انہوں نے افسانے کو اہمیت دی ہے۔ انہوں نے اپنا اختجان ”عدو چا“ کے عنوان سے ۱۹۵۵ء میں لکھا جوان کے افسانوی جمود ”دو بیکے ہوئے لوگ“ کا ترتیب وارد سر افسانہ ہے۔ یہ افسانہ اقبال مجید نے ایک خبر ”ہاکر“ سے متاثر ہو کر لکھا جوان کے ہی تھے میں رہتا تھا۔ انصاری کوی افسانہ، بہت پسند آیا۔ اس کو شاہراہ میں اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کرادیا۔

اس افسانے کی تقویل کے بعد یہی بعده مگر ان کے افسانے اردو کے موتز رسالوں میں شائع ہونے لگے اور انہیں قول عام حاصل ہوئے۔ درمیانی برسوں میں تقریباً دس برسوں کا وقف ایسا بھی رہا جس انہوں نے اپنے قیمتی اوقات میں جیسی کی نظر کر دیے اور افسانوں سے اتنی توجیہ کی طرح سے ہٹ گئی۔

۱۹۹۱ء کے بعد پھر پا قاعدی سے کہانیاں لکھنے لگے۔ ان کے افسانوں مجموعہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ دو بیکے ہوئے لوگ ۲۔ ایک طفیلہ بیان ۳۔ ہیر بنسیب ۴۔ تماشا گھر ۵۔ آگ کے پاس پیشی عورت

۶۔ ۱۹۸۰ء نصرت پہلش لکھنؤ ۷۔ ۱۹۹۹ء معابر پہلش، دہلی ۸۔ ۲۰۰۳ء ایکی ٹکنل پیشکھ بہادر، دہلی ۹۔ اس کے علاوہ انہوں نے ڈیڑھ سوریہ یا اورٹی۔ ویڈیو میں بھی لکھے۔ ان کے افسانوں کے ترجیح دیکھنے زبان میں بھی ہوئے۔ اب تک ہندی، مرائی، انگریزی اور روی زبان میں ان کے ترجیح ہو چکے ہیں۔

اقبال مجید کی شاخت نئی نئی ترقی پرند افسانہ نگاروں کی حیثیت سے ہوتی ہے ۱۹۹۰ء کے پانہوں نے پورے جھوٹ و خوش کے ساتھ افسانوی دنیا میں قد مرکھا اور جلد ہی اپنی ذیانت اور محظہ صلاحیت کی بنا پر بلند مقام حاصل کر لیا۔ اقبال مجید کے کئی ہم عصر افسانہ نگار افسانوی دنیا میں پانلوہا منواچے تھے جن میں جو گندر پال، رنگ،

تیار کرتے ہیں جس کی نوعیت کمی اخلاقی، تہذیبی، معاشرتی، اور سمجھی سماجی یا پھر فلسفی تھی ہے۔ علامت نگاری کی بہترین مثال ان کا افسانہ ”پوشک“ ہے۔ جوان کے انسانوں مجھے ”قصہ رنگ ٹکش“ کے پہلے دور میں شامل ہے۔ یہ مخصوص ان کے منتخب انسانوں پر مشتمل ہے۔ افسانہ پوشک انہوں نے امر حجتی کے دوران لکھا ہے افسانہ اپنی نوعیت کا، بہترین افسانہ ہے۔

اقبال مجید خودا پنی افسانہ نگاری کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:
میں نے بہت بیکن پڑھا، آج گھی شیم خوندہ ہوں، لکھ کر دلی تیوریوں،
تحریکیں، تقدیریں، مضمونوں، وغیرہ سے جو بھی میں نے علم حصل
کیا اور افسانہ لکھنے کے لئے جو بھی ابجذب اہم ہے ذہن میں مرتب ہوا ہے سارا
کام سار افسانہ لکھنے و قصہ صرف افسانے کے خواہ پڑھنا ہے پڑھنا ایکٹے کے
اردو گوہ متارہا جس کا تباہ مجھے اس وقت چلا جب کہ میں افسانہ لکھ کر تھا
کوئی **Narrative Expression** ہماری وجہ میں ہی نہیں بلکہ ہماری
روح صدر میں کس طرح گلکل ایکا ایک بارہا جاتا ہے وہ بھی اپنے ان کے،
حیرت انگیز اور گمراہنگی تمام جہاں کے ساتھ اس کا جواب اگر کسی نے تو بکار گھوڑا
پڑھنے کے بعد منہ سے پوچھا ہوتا تو وہ بھی نہ دے پاتا۔ تھیں یہ شرحتیں کارو بھی
متحیر کر دیتی ہے۔ تھنی اپنے قارئی کو۔ میری تھیں میں میں کہو ہے؟ یہ سوال پوچھا
جا سکتا ہے میری اپنے جواب ہے کہ اگر ایسا کچھ ہے تو میرے علم میں نہیں ہے کیونکہ لکھنے
وقت میری زیادہ تر توجہ تو ترقی پسندی اور جدیدیت کی خواہ کے لئے مزید کر کے
اسے زیادہ للتی استعمال ہاتے میں لگی رہی کیونکہ یہ دونوں اپنے اپنے وقت کی
طااقت و راہور با اڑھر بکیں تھیں۔۔۔ کہانی اپنے ایچٹے کی سچائیوں کے ارد گرد پھر
کاشتی میاہی میں جیتی اور مر جاتے ہے۔”
(قصہ رنگ ٹکش، میں نقش پاکی طرح پہمال اپنا ہوں، ص ۱۰-۱۱)

اقبال مجید پر بنیادی طور سے ترقی پسند ادب کا گہرا اثر
خداوہ آزاد سوچ اور طلبہ ذہن کے مالک تھے۔ انہوں نے ترقی پسندی کے اصولوں کی
شدت پسندی کو اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے انسانوں میں مختلف تحریبے کی وجہ سے وقت کی
ضرورت کا تقاضا کئے اور اور ترقی پسندی اور مارکسم میں مخالف تھے۔
کہانی کے فن پر اقبال مجید کی پکڑ اس قدر رخت ہے کہ کسی بھی واقع کو ایک نیا موز
دے کر افسانے کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے انسانوں میں تھی زندگی کی
ترپ پائی جاتی ہے۔ یہ شرحتیں میں ہڑاہ اور سبک روی ہے اور واقعات اس
امداز سے آگے بڑھتے ہیں جیسے آہستہ آہستہ کا میاہی سے اپنا سفر طے کر رہے
ہوں۔ اقبال مجید کا ذہن معلومات کا خزانہ ہے جوان کے مطالعہ اور مشاہدے کا نتیجہ
ہے یہی خزانہ ان کے انسانوں میں بھی ملتا ہے۔
پروفیسر قریبیں اقبال مجید کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:
”اقبال مجید کی اور کئی نہیں خودا پنے مقلد ہونے سے بھی مفرک ہیں۔ نئے شیر
زور بخوبی کر زبان دینے کی ترپ ائمہ نہیں خودا پنے فن کے حصاروں سے باہر گھٹا تی
بھی ہے کم و میش ہر کہانی میں ائمہ بیان کا کوئی یا اسلوب ایسے امکانات تلاش کر
لیتائے اور وہ اس لیے کہانی کہانی میں خواہ وہ کوئی چکا دینے والی بات نہ ہیں لیکن
اپنے عہد کی انانی صدقتوں کو کسی بھی بھت سے دیکھنے اور کھش کی کوشش ضرور کرے
ہیں۔ افسانے کی روایت اور اس کی وحدت کے تصور سے کسی لواؤ موزانہ بغاوت کے
بغیرہ افسانہ کو ایک بھی جمالیتی فہرست سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔“

کے پلاٹ ڈھیلے اور اوسط درجے کے بھی دیکھنے کو بخے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ان
کے انسانوں میں کوئی کی محسوں نہیں ہوتی۔ اقبال مجید نے اپنے انسانوں میں افسانے
کے ایزاۓ ترکیبی کو ترتیب کے ساتھ برنا ہے۔ کردار نگاری، مظہر نگاری، مکالم نگاری
اور اختتام کے میں سے ایک ایسی کش پیڈا ہوئی ہے جو افسانے کو کامیابی کی بلندی کی
لے جاتی ہے۔ افسانے کی انتقام میں تی قاری کی ایسی وچھپی بیدا ہوتی ہے کہ وہ
اختتام سک پیچھے پر موجود ہوتا ہے۔ اقبال مجید کردار نگاری کے ہمراستے بھی واقف ہیں ان
کے کردار یادگاری نہیں بلکہ جاذبگی ہوتے ہیں۔

ان کے کردار اپنی خودکی زبان بولنے اور سکھی فہنمیں آزادانہ طور پر سانس

لیتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں۔ یہ کردار اقبال مجید کے قلم کے محتاج نہیں ہیں۔ یہ
آزاد اور بے باک ہیں جو سبق طور پر اپنے وجود کے لئے جو دجد کرتے ہیں۔ یہ
اپنی مرثی کے مطابق کام کرتے بولتے اور چلے ہیں اور یہی نہیں ان کے فیض بھی
خود مختار ہوتے ہیں۔ مثلاً ”شہناز، شہرو، جوہی، احمد وغیرہ۔ اس کے بخلاف بعض
کردار ایسی بھی ہیں جو سلسلہ کوٹھ کے بعد بھی ہارہمان لیتے ہیں اور حالات سے سمجھتا
کر لیتے ہیں ان کرداروں سرفہرست نام عدالتی کا ہے۔ ان کے انسانوں میں مکالم
نگاری بھی بہترین مثالیں موجود ہیں ان کے تھیں کئے ہوئے مکالمے ان کی تھیں
سے زیادہ کرداروں کی اپنی زبان معلوم ہوتے ہیں ان کا معلوم میں کی ادائیگی میں
ڈرامی یقینت پائی جاتی ہے۔ کردار اس طرح بات چیت کرتے ہیں جیسے اسٹچ پر کوئی
ڈرامہ پیش کیا جا رہا ہو۔ ان کے بعض انسانوں کی شروعات سیدھے مکالموں سے ہی
شروع ہوتے ہیں اس سلسلے میں ”پیٹھ کا چوپا؟“ ”ایک دن ایک رات“ کو کھا جاسکتا
ہے۔ مظہر نگاری اور جزیات نگاری میں بھی وہ پچھپے نہیں رہتے۔ کسی بھی واقعہ کی اسی
تصور پڑھتے ہیں کہ پورا مظہر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ وہ ایک معمولی چیز کو بھی
معنی نہیں بنا دیتے ہیں۔ ساتھ ہی مظہر نگاری ان کے افسانے کو آگے بڑھانے میں مدد
گار ثابت ہوتی ہے۔

۔

اقبال مجید کے انسانوں کا اختتام آغاز کی طرح ہی دلچسپ ہوتا ہے۔ کبھی تو وہ
فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کہ سوال کی کھجاش ہی باقی نہیں رہتی اور قاری پر اس
طرح کا اثر چھوڑتے ہیں کہ وہ غور و فکر کا عادی بن جاتا ہے یا پھر رائیناں بخش تاثرات
قائم کر دیتے ہیں۔

اقبال مجید کی افسانہ نگاری میں اختصار پایا جاتا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں اپنی
بات کیسے کہر جاتے ہیں مانوریا کو کوئے میں بھر دیا ہو۔ چھوٹے چھوٹے جملوں
میں بھی چڑی باتوں کو اسائی سے ادا کر دیتے ہیں اور اشاروں کے دریہ بھی بات کو
سمجھانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ان کے انسانوں میں ڈرامائی یقینت
پائی جاتی ہے مگر یہ غصر ان کے انسانوں کا عیب نہیں بلکہ ہر بن جاتا ہے۔ اقبال
مجید اپنے انسانوں میں علامت نگاری کو برتنے کے ہمراستے واقعیت رکھتے ہیں اور
انہوں میں علامتوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ علامتوں انسانوں کا اہم غصر
معلوم ہوتی ہے۔

ان پر تمام ادیبوں کے اثرات کو آسانی دیکھا جاسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے
کہ انہوں نے نہ صرف صفت، بیدی اور منہو کو پڑھا ہے بلکہ جیونوف، ہوسپاں،
پاٹر لکھی ٹالٹائی، بڑگیں وغیرہ کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ علامت کو بھی
اپنے انسانوں میں ایک علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ افسانہ کو علامت
بنانے کے بجائے الفاظ کو علامت کے طور پر استعمال کر کے ایک ایسی صورت حال

غزل

میناخان۔ گریٹرنویڈا

عشن کرتے رہے اظہار کی بہت نہیں کی
ہم بھی خاموش رہے اس نے بھی زہمت نہیں کی

بیرونی غم کی ترے کی ہے ہمیشہ دل نے
ایک لمحے کو بھی غفلت کی جسارت نہیں کی

دشت و صحراء میں چلے آئے جنوں کے ہمراہ
ہم نے اس سے تو کبھی اس کی شکایت نہیں کی

ربط ایسا کہ کوئی فیض نہ پائے اس سے
اس نے چھپ پر تو کبھی نظریں عنایت نہیں کی

کس نے دیکھی ہیں بتاؤ میری بھگل پلکیں
کون کہتا ہے تیرے غم کی خانست نہیں کی

بھر کا دور گزاہ ہے یوں ہم نے مینا
دھڑکنیں چپ رہیں انکوں نے بغاوت نہیں کی

(مicum اردو لکھنؤ اپریل ۱۹۸۵ء، بحوالہ قریبیں۔ ترقی پسند ادب کے مدار، ص ۱۵۰) اقبال مجید نے کئی ایسے انسانے لکھے جو انسانی زندگی کو پیش کرتے ہیں اور اس میں ہونے والے لفظ و لفظان کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس طرح کے انسانوں میں "متوکس"، "بڑے بایو" اور "بے سہارا" جیسے انسانے شامل ہیں۔

اقبال مجید کی گرفت محض انسانوں پر ہی نہیں بلکہ نادل اور نادل پر بھی مضبوط ہے۔ وہ کہانی کا میں نہ صاف اور ماحول کے مطابق کرتے ہیں اور یہ کوشش ان کی کہانیوں میں ایک یا اپن پیدا کردیتی ہے۔ اب تک ان کے دو ایک نادل "سکی دن" ادارہ "یا سفر"، الہ آباد سے شائع ہوا اور دوسرا نادل "نیک" بھی اسی ادارے سے مفترع پر آیا۔ نادل شائع ہو چکے ہیں۔

اقبال مجید کا نادل "نیک" (مارچ ۱۹۹۹ء)، اپنی نویت کی مندرجاتیں ہے۔ اس نادل میں ایک طرف زوال آمادہ تہذیب ہے تو دوسری طرف زندگی کے بدلتے دھارے اور ان سے ممتاز تہذیبی فوری ہیں۔ ٹیکم خنی، نیک ذائقہ بھی ہے اور زنجیر بھی کے عنوان سے نادل نیک کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس نادل نیک میں انہوں نے اپنے آپ کا اس طرح عبور کیا ہے کہ پہلے صفحے سے آخری صفحہ قصتے میں کہیں بھی اُن کی طرف سے کسی طرح کی مداخلت کا احساس نہیں ہوتا۔ ایک دھنی، خوش خرام، متناسب اور معازن یا یہ کی میسان کیفیت شروع سے آخر کنٹ قائم رہتی ہے"

اور ساتھ ہی نادل کی یہ غزل بھی لفظ کرتے ہیں:

زخم پر چھڑکیں کہاں طلاقاں بے پروانہ نک
دل طلب کرتا ہے زخم اور مالگے ہیں اعضا نیک

زخم سے گرتا تو پکلوں سے چتنا تھا نیک
نادل "سکی دن" آج کے ہندوستان کی کہانی ہے یعنی وہ ہندوستان جو صرف شہر

نیک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دیہات و قصبات کی وسیع و عریض اور زیمن جاندار اور

سیاست و طاقت کی صورتوں میں ہے۔

بقول علی احمد فاطمی:

"دور رامعاشرہ بلکہ پوری زندگی دوہرے پن اور کوکھے پن کا لکھار ہو چکی ہے۔ اور تبدیلی کی ایسی صورت ہے کہ جس کی راہیں کھلی ہو کر بھی مسدود ہیں جس کی کنیتی مزول نہیں۔ ایسی تخلیقی تغیر کار دوڑ کے متاز انسانہ نگاہ اور اب نادل نادل اقبال مجید کے سخت مددوڑ ہن نے بہت قریب سے دیکھا ہے، سمجھا ہے زور اکثر و پیشتر اس کا حصہ بھی بنے ہیں۔ اس لئے ان کے مغربوں اور مشاہق نے ان سورتوں کو اپنی ان تمام ترجوں نہیں اور جلیقی توتوں کے ساتھ پہنچی بار نادل کی ٹھکل میں پیش کیا۔"

حال میں اقبال مجید کے انتقال کے بعد ادبی دنیا میں ان کی ادبی تخلیقات کا ادبی سفر گیا۔ لہذا انہوں نے ادب میں

تجددیات میں کیس کیں ان کی اہمیت کو بھی فرماؤ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہ ان کی ادبی

تخلیقات ان کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

● ●

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے مضامین کا مجموعہ

تفہیمات و ترجیحات

فرسودہ موضوعات، کہنہ نظریات اور بوجمل ثقل اصطلاحات کی وجہ سے تقید ایک کلیشے میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔ تکرار اور یکسانیت نے شاید قارئین کو تقیدی تحریروں سے پیڑا کر دیا ہے۔ ایسے میں نئے موضوعات اور نئے زاویوں کی جگہ تو یقیناً ایک دشوار عمل ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے مضامین کا مجموعہ ”تفہیمات و ترجیحات“ کا خصوصی یہ ہے کہ اس سے تقیدی بھس، تازگی، تنوع اور ہمیں علمی مطالعات کی ایک اچھی صورت سامنے آتی ہے۔ اس میں مختلف ادبی تصورات، تقیدی میلانات اور جوانات کے حوالے سے تحریریں شامل ہیں۔ اساطیر، جمالیات اور اسالیب کے علاوہ ان موضوعات کو بھی محور بنا لیا گیا جو عصر حاضر میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ”تفہیمات و ترجیحات“ میں شامل تحریروں کا ایک امتیاز یہ ہے کہ یہ ارتكاز، اٹھاک اور مراقباتی کیفیت میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں اعلیٰ تقیدی بصیرت کا عس بھی ہے اور مطالعاتی وسعت بھی۔ ”تفہیم و تحریر“ میں بھی منطقی اور معنوی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ان مضامین سے فکر و نظر کے نئے دریچے کھلتے ہیں اور ”تفہیم و تحریر“ کے دروازہ تو ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اپنی وہنی ساخت اور علمی بصیرت کے اعتبار سے ادبی دنیا میں ایک امتیاز رکھتے ہیں۔ بر صغیر کے مقدار رسائل و جرائد میں ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اساطیر اور جمالیات پر ان کی گہری نظر ہے۔ معاصر ادبی تحریکات و رجحانات سے بھی باخبر ہیں۔ علمی ادبیات سے بھی ان کی گہری شناسائی ہے۔ ”ادب، اسطورہ اور آفاق،“ ”اردو غزل کا عبوری دور،“ ”ادب اور جمالیات،“ ”مغث الدین فریدی کا تخلیقی کیوں،“ ”فن تعمیم نگار وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں جن کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیر ای ہوئی۔ دہلی یونیورسٹی سے فیض یافتہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کو مفتخر اداروں اور کامیوں کی طرف سے اعلیٰ اعزازات بھی مل چکے ہیں۔ ستیہ دنی کا لمحہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ان کی واہنگی ہے۔ اس وقت اردو قومی کونسل کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس کتاب کی قیمت 130 روپے ہے۔

اگر آپ اس کتاب کی پہنچ کاپی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو رابطہ کریں:

Sale-cum-Exhibition Centre

West Block - 8, Wing - 7, R. K. Puram, New Delhi - 110066.

Telephone : (+91 - 11) 26109746, 26108159

Fax : (+91 - 11) 26108159

email: sales@ncpul.in, ncpulseunit@gmail.com

ظفر اقبال کا کالم اور ان کے مختلف شعری انتخابات

معترضین اقبال اور اقبال شاسی اور ابرار احمد کی نظم

جدھر کو جانہیں پائے، اُنھر کل جائیں
جو شطر تھا ما راء، جو راہ مکتا تھا
جو ہم پر آئیں ہوتا، جو ہم پر کھلانہیں
جو ہم پر کھلانہیں، اس حصار کی جانب!
کسی طلب کو، کسی انتظار کی جانب!
آج کا معنوں:
اور بھی اب تو ضروری ہے ظفر میرے لیے
اپنے اندر کے اندر ہے کاستارہ ہونا
(۱، مارچ ۲۰۰۳)

اور اب آخر میں ابرار احمد کی نظم:

بھی الگانہیں ہے
ہے دھشت سی کوئی سینے سے کفرانی
دل بے حال سے ابھی
درو دیوار سے گرتی ہے جمانی
تھکھے اعصاب میں
انٹھنی سی اک سوئی ہوئی ہے
نیندی کی صورت-----
شاہست کی رعایت سے
محبت کی علامت سے
جنہیں پہلو میں رکھا تھا
کہ جن میں سانسِ الی تھی
کہ جن میں جان کی تھی
بلاتے ہیں انہیں رستے
وہی رستے، جدھر کو تم گئے تھے
لوٹ کر آئے تین تھے
حد امکان سے آگے کہیں
ہنسنے ہوئے روتے ہوئے
آن دن بھی دنیا کوں میں رقصان

معترضین اقبال اور ڈاکٹر ایوب صابر کی اقبال شاسی پروفیسر ریاض احمد کی
تصنیف ہے جسے قلم فاؤنڈیشن اٹریٹھل لاہور نے چھاپا ہے۔ میں سرور ق ڈاکٹر
عبدالقدیر خان کا تحریر کردہ سے جبکہ اندر وون سرور ق جبار مرزا کی رائے درج کی
گئی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم سالیق صدر شعبہ آزاد آزاد جموں و کشمیر
یونیورسٹی، مظفر آباد کے مطابق ریاض احمد نے "معترضین اقبال اور ڈاکٹر ایوب
صابر کی اقبال شاسی" میں اقبال پر اٹھائے گئے اعتراضات کا مختصر مطالعہ پڑھ کیا
ہے اور مختار اقبال شاسی پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر کی اقبال شاسی پر تجویزیاتی اور
تجزیاتی انداز میں بحث کی ہے۔ ریاض احمد ان خوش قسمت کالریز میں سے ہے میں
جن کا سندی مقالہ کتابی صورت میں اتنی جلدی شائع ہو رہا ہے۔ اس کے لیے
ریاض احمد مبارک بادار کے سبقتی یہی کہ ان کی عرق ریزی کا آئی اور ایک معیاری
کام کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ریاض احمد کا اسلوب عمدہ ہے جو تنقیدی بھی ہے اور
تجزیاتی بھی اور انہوں نے اپنی اس کتاب میں دونوں اسایب کو خوبصورتی کے
ساتھ برٹا ہے۔ کتاب بڑے سائز پر گھمہ گیت اپ میں شائع کی گئی ہے جو علمی و
ادی حلقوں میں بطور خاص پسندی کی جائے گی۔

اور اب ابرار احمد کے شعری مجموعے "موہوم کی مہک" میں سے یہ نظم:

کی انتظار کی جانب
ازل سے چلتے رہے ہیں مگر کھڑے ہیں وہیں
دیا یو دیدہ دوں میں وہی دھنڈ کا ہے
اکی زمیں پر قدم، سر پر آسان ہے وہی
کہیں پر دور ہیں ہم کو جا کے مانا تھا
کسی خیال سے، اک خواب خوش نہماکی طرف
ٹکتے جانا تھا تو نے ہوئے خمار کے ساتھ
نہ جانے کیا تھا جسے ڈھونڈنے لکھنا تھا
روہ جود میں اڑتے ہوئے غبار کے ساتھ
رہے اسیرو دو بامِ زندگی ہرم
وہی جو خستہ تھے معمول روہ دش کی طرح
بس ایک چاک پر ہم گھوٹتے، اور ہر تے رہے
سواب خرام کریں راہ معدارت پکھیں
چھکن سے پیٹھر ہیں نہ گئے عافیت میں کہیں
کہیں سے توڑ دیں دیوار ایستادہ کو

إدھر۔

اب "موہوم کی مہک" میں سے ابراہم کی نظم:

کہیں ٹوٹے ہیں
بہت دور تک پہ جو دیانی رہ گورہ ہے
جہاں دھول اڑتی ہے
صدیوں کی بے اختیالی میں کوئے ہوئے
قاقوں کی صدائیں، بھلکتی ہوئی
پھر رہی ہیں درختوں میں۔۔۔۔۔
آنسو ہیں
صحراؤں کی خاشی ہے
ادھرتے ہوئے خواب ہیں
اور ہواں میں اڑتے ہوئے نشک پتے
کہیں بخوبی ہیں ہیں
صدائیں ہیں
افسوں ہے ستوں کا۔۔۔۔۔
حد نظر تک پہ تاریک سا جو گرد ہے
افن تا افق جو ہنیری ردا ہے
چہاں آنکھ میں تیرتے ہیں زمانے
کہ ہم ڈوٹتے ہیں۔۔۔۔۔!
تو اس میں تعلق ہی وہ روشنی ہے
جو جیتنے کا سر دھانی ہے ہم کو
سو کاموں پہ بآخوں کا مس گریداں ہی
ہونے کا مفہوم ہے غالباً۔۔۔۔۔
و گرنے والی رات ہے چارنوں
جس میں ہم تم بھکتے ہیں
اور لڑکھراتے ہیں گرتے ہیں
اور آسان ہاتھ اپنے بڑا کر
کہیں تاک دیتا ہے ہم کو
کہیں بھرپتکتے
کہیں ٹوٹے ہیں۔۔۔۔۔!
آج کا مطلع
اس کے گلب، اس کے چاند حس کی بھی قسمت میں ہیں
آپ، ظفر، کس لیے اتنی مصیبت میں ہیں
(۷ فروری ۲۰۲۰)

سر پھر ڈتی ہے
گوچتی ہے بے کلی کوئی
ابھتی ہے رگ دپے سے
اویز ہے جاری ہے چادر شہ کو
پتکتی ہے انہیں سے بھری آنکھوں میں
اک سیال کی صورت
خلائی گرخ نک کے چار سورقصال ہے
رخ خواب کی صورت
کی گرداب کی صورت
حساب رفتہ موجود میں
فرانسیں کچھ بھی
فریپ آزو کیا ہے
رخ زبانیں پچھے ہی
نچشم واب بلاتے ہیں
ناب کوئی طلب آواز دینی ہے
ہے ہبراہٹ کوئی، جس نے
کہیں کا بھی نہیں چھوڑا۔۔۔۔۔
ناب گھر باری کچھ ہے
نہ کوئے پارہتی کچھ ہے
ادھر بھی کیا رہا تی
ناب اس پارہی کچھ ہے!
آج کا مطلع
گلی گلی مرے ذرے بکھر گئے تھے ظفر
خبر نہی کہ وہ کس راستے سے گزرے گا
(۲۰۲۰ فروری)

درستی

عمران یعقوب خان نے جادید اختر کے یہ دو شعر درج کیے ہیں:
آدمی جو کہتا ہے آدمی جو نہتا ہے
زندگی بھروہ صدائیں پچھا کرنی ہیں
آدمی جو دیتا ہے آدمی جو لیتا ہے
زندگی بھروہ دعا کیں پیچھا کرنی ہیں
ان اشعار میں ہر صریغ ٹانی خارج از وزن ہے:
ع زندگی بھروہ صدائیں پچھا کرنی رہتی ہیں
ع اور زندگی بھروہ دعا کیں پیچھا کرنی رہتی ہیں
فلمی گانے اکڑھوں پر لکھے جاتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ جادید اختر نے یہ کی بیش
اسی دھن کے حوالے سے کی ہو۔

مکر سانس --- جانے اسے کیا ہوا
 کوئی پڑھتی ہوئی پچھاں تھی
 اور گھیرے میں لیتی ہوئی
 کوئی سیال ٹلمت ---
 تو پھر --- میں ادھر
 اپنے آنکھن میں اپے کھلنوں سے
 اور دوستوں سے
 ہمکتے ہوئے باتیں کرتا ہوا
 خوپرواز تھا
 اور نیند آرہی تھی
 گھنی، گھری، ناریک
 ماں جانے اس خواب کو جا پچھی تھی ---
 بہت دیریک
 پانیوں نے تھپک کر سلایا مجھے
 اسی ریت پر ---
 جس سا ب میں پڑا
 اپنی چھٹی ہوئی پیٹھیوں میں
 خدا دیکھتا ہوں ---
 خدا --- جس نے بھجا مجھے

”اجراء“ یوسفی نمبر اور ابراہم کی نظم

اجراء (یونسی نمبر)
اقبال خوشید کی ادارت میں شائع ہونے والے اس کتابی سلسلے کا یہ مشتق یونسی
نمبر ہے۔ سروق پر یونسی صاحب کی تصویر ہے پس سروق رائے ظاہر کرنے
والوں میں ابن انشاً، جمتوں گورکھوری، ممتاز حسین، ڈاکٹر اسلام فرمخی، ریکس امر و ہوی،
سید ضمیر جعفری اور ڈاکٹر ظہیر قطبوری شامل ہیں۔ ابتدا میں "قطرے میں سمندر"
کے عنوان سے شاہین بیازی کی تحریر ہے جس کے مقابل مصور شاہد رسام کا بیان
ہوا یونسی صاحب کا پورٹریٹ ہے اور اس کے بعد الی خانہ کے ہمراہ یونسی صاحب
کے گرد پوٹوڑ ہیں۔ اس کے بعد مرحوم کی بعض تحریروں کے عکس شائع کیے گئے
ہیں اور مرحوم کی تصانیف، چار غلتے حامد بہن، زرگزشت اور آبم پر غطفہ
مشابہ کے مضمایں ہیں۔ اس کے بعد اٹروپیز ہیں، پھر ان کے خطوط ہیں، یہ
جریدہ ہمارے عہد کے نامور اور مستند مراجع نگار پر ایک بھرپور دستاویز کی حیثیت
رکھتا ہے جس کی حدود صورت بھی تھی اور جنمیں رفتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا،
اور تین سو صفحات پر مشتمل یہ جریدہ خاصی حد تک اس کا حق بھی ادا کرتا ہے اور یہ
صحیح معنوان میں ہمہ یونسی تھا جو ہم نے لگزارا ہے۔

اور اب آخر میں ابرا راحمد کی یہ نظم:

ایلان گردی کی خودکلامی کوئی پاچھل سی تھی

شورتھا چارسو

بیچارہ ہو
مجھے کہا تا

کیا ہوا تھا کہیں

جب مجھے ساتھ لے کر

مری مان نے سینئے سے

بازو پہ تھا

اور، مپل رہے ہے

* حا ن کارک

سمندر بھی میں نے دیکھ

مگر کیسا منتظر تھا

جی چاہتا تھا

اسی ڈولتی، ڈوبتی ناؤ سے

لطف جاؤں لہروں پا اڑ

پرندوں کی صورت پہنچ
مگر ----- طاں نسخہ

مانی کے اندر

میں ہے کچھ کہا۔

جنوری، فروری

درستی اور ابراہیم کی نظم

جو اور یہ حفظی نے اپنے کالم میں ایک شعر اس طرح سے درج کیا ہے:
 تقدیر کے قاضی کا فتویٰ ہے اzel سے
 ہے خرم ضعیفی کی سر امرگ مفاجات
 اس کا پہلا صدر عہد خارج از وزن ہو گیا ہے جبکہ میری نظر میں اصل صدر عہد طرح
 سے ہو سکتا ہے ع
 تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے اzel سے
 ٹوپیہ خان نیازی نے اپنے کالم میں ایک شعر اس طرح سے لکھا ہے:
 کیوں گردشِ دماد سے گھبرانے جائے دل
 نسان ہوں پیاتہ ساغر بیش ہوں میں
 دوسرا صدر غلط ہے جو کچھ اس طرح سے ہے ع

جو کھانے کو آتا ہے
 اس شور کا
 جس کے باطن میں
 گہری خوشی کی بیبٹ چھپی ہے
 تمہارا کروں کیا
 ادھیرے چلے جا رہے ہو مجھے
 کروں کیا
 میں اس بے نہایت محبت کا
 وارثی سے جو بڑھتی ہے
 مجھ سے لپٹنے کی خاطر
 تو منہ موڑ
 میں کہنیں جانکتا ہوں
 ویاں نیلوں کے پیچے
 ترپتی ہوئی ریت میں
 چینخے کے لیے ---!
 ☆☆
 آج کا مقطع
 دھھنی غلصی اتنی تھی ہمارے ہر نو
 ہم نے ہبرائے ظفر خوف خدا چھوڑ دیا

(۲۰۲۰ء)
بیکری یروز نامودنیا

●●

اور اب آخر میں ابراہم کی یقین:
 کیا کروں ---?
 میں اس خامشی کا کروں کیا
 جو مجھ سے سدابات کرتی ہے
 کرتی ہی رہتی ہے
 اور آنسوؤں کا
 جو پہنچتے ہوئے بھی
 مری آنکھیں تیرتے ہیں
 میں --- صروفیت کا کروں کیا
 کہ جس میں
 فراغت کی ناختمہ بدلی ہے
 کروں کیا، میں اس بے گھری کا
 جو میرے تعاقب میں
 روزاں سے چلی آ رہی ہے
 کروں کیا، میں اس خالی پن کا

سبق اردو 70

انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
 اور اب آخر میں "موہوم کی مہک" میں سے ابراہم کی یقین:
 آخری بارش
 ایک محبت کے باطن میں / کتنے چند بے ہمک رہے ہیں / ایک چکتے نمکھ میں / کتنے
 چادرستارے دمک رہے ہیں / جانگنے کی ساعت کے اندر / آنکھی صدیاں سوئی ہوئی
 ہیں
 دلوں میں اور دروازوں میں / کہیں ابھی موجود ہیں شاید / رستہ بیکی / جھکی ہوئی بیکیں
 اور بارش / جہاں سے کوئی مہک پرانی / میری میں اڑا رہی ہے / تیرے کپڑے پکڑ
 رہی ہے
 جتنے اشک تھے لہو کے اندر / اتنے چھول کھلا آیا ہوں / جن ہونڈوں پر چکا، ان پر /
 چپ کی نہر لگا آیا ہوں
 جتنے خواب بھرے تھے میری نیندوں میں / اتنی تھیروں کے پیچے بھاگ چکا /
 ایک نوع کے آنسو آنکھ سے کر جاتے ہیں / اور طرح کے بھر جاتے ہیں
 رستوں کے اندر رستے ہیں / سفر کے اندر سفر چھے ہیں / بادلوں کے اندر بادل ہیں /
 چھینتوں کے اندر چھینتے ہیں / بارش تو گرفتی ہی رہے گی / دنیا تو بھتی ہی رہے گی
 جو بھی چلتا ہے بارش میں / جو بھی گھومتا ہے نمی میں / کھو جاتا ہے / کھو جاتے گا / عمر
 کی بھی سرحد ہوئی ہے / رقص کی بھی اک حد ہوئی ہے / جیلے --- اب میں بھی تیار
 ہوں / اکھم جانے کو اسی مہکی میٹی میں / کھل مل جانے کو ---!
 آج کا طفظ
 جان ٹھر در کارے اب تو
 میخی بات اور پھر کچائے
 ۲۰۲۰ء فروری

گوہر زہرہ

نظیرا کبر آبادی
جتنا ہوا سے بند قابض حل گیا را

ہم لوگ اس تدریجی کسی سے کہاں کھلے

محسن نقی

خوبی کی سر دلہر سے جلنے لگے جو خشم
پھولوں کو تیر لیند تباہ کھلنا پڑا

محسن نقی

کھنڈے کے باوجود وہ مجھ پر نہ کھل سکا
بند قابض کے بعد بھی رگر ہیں بہت سی تھیں

فیض باری پوری

صرف مانع تھی حیات ند تباہ کھلنے تک
پھر تو وہ جان حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

راسچنانی

پر یہ آخر صبح تو کھولے گی کب بند قابض
جمان کا نہ چلنے والوں سے آفتابوں کا بدن

پر یہ دار برتی

ہمارے عہدی تہذیب میں قبھی نہیں
اگر قابض ہو تو بند قابض کی بات کریں

ساحر لہیا نوی

پھولوں میں خوبیوں میں ستاروں میں چاند میں
کھولے گا کوئی بند قابض جائے رہو

منصور عثمانی

چاک کرتا ہوں اسی غم میں گرپاں کفن
کون کھولے گا تیر لیند تباہ کی بعد

منور خان غال

آنکھ تھک جاتی ہے جسم بند قابض حلتے ہیں
تجھیں اٹھتے ہوئے خورشید کی عیانی ہے

مصطفی زیدی

زندگی کچھ نہیں، خود جو اسی
اس بند قابض جو ہم سے چلا جائیں

جون ایلیاء

چاک پیرا نتی گل کو صبا جاتی ہے
مسٹی شوق کہاں بند قابض جاتی ہے

احم فراز

ہم بھی کچھ اپنے دل کی گرہ کھولنے کو ہیں
کس کس کا آج دیکھیں بند قابض حلے

بند قابض متعلق اشعار

تھے چاک گرپاں گلستان میں گلوں کے
لکلا ہے مگر کھولے ہوئے بند قابض

میر قی میر
دیکھیں تو کاربستہ کی کب تک کٹلے گرہ

دل نشی ہے یار کے بند قابض کے ساتھ

میر قی میر
بند قابض کو خوبیں جس وقت واکریں گے

خیڑا ہے جو ہوں گے لٹے کیا کریں گے
میر قی میر

اسد بند قابضے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وابہ، تو کھلادول کیے عالم گلستان ہے

اسد اللہ خان غالب

نذر نگہ سے ہے واشدگل
مست کب بند قابض باندھتے ہیں

مرزا غالب

کشاو دل پے باندھی ہے کمراج
نہیں ہے نیریت بند قابض

مومن خال مومن

جامس سے باہر اپنے جو ہوں میں عجب نہیں
کھولے ہیں کس کے بند قابض کچھ نہ پوچھیے

حیدر علی آتش

اتنی بڑی حاپاک دوامال کی حکایت
دامن کو ذرا اوپر بیٹھ رابعہ قباد کیہ

مصطفی خال شیفتہ

کیا کرتے ہیں کیا نہتے ہیں کیا دیکھتے ہیں ہائے
اس شوخ کے جب کھولتے ہیں بند قابض

مصطفی خال شیفتہ

دل کی ہماری غرض باندھتے ہے کیا بند بند
شوخ کا وہ کھول کر بند قابض بیٹھنا

شیر کا احساس اور دیگر افسانے

اویناں امن

دوسرو پچھے

2019

160 صفحات

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE NEW

DELHI

ادبی کتابی سلسلہ ۲۰

سے ماہی

تفسیم

منظرا عالم پر آچکا ہے

ISSN 2347-7415

مدیر:

عمر فرحت

9055141889

زرسالانہ ایک ہزار روپے (ہندوستان میں)

تفسیم کے شروع سے اب تک کے تمام شمارے آن لائن پر ہمے کیلئے:

www.rekhta.org.ebook

کلیم عاجز
خیال میں جر اٹھنا مشاں بیدر قبا
مگر گرفت میں آتے ہی راز ہو جانا

عرفان صدیقی
اس کے بیدر قبا کے جادو سے
سانپ سے انگلیوں میں پلنے لگے

امجد اسلام امجد
ہاتھوں میں دیر تک کوئی خوبی رہی
دروازہ چون تادہ ہمہ تبانقا

امجد اسلام امجد
کھول کر بیدر قبا گل کے ہوا
آج خوبی کو رہا کرنی ہے

پروین شاکر
وہ بیدر قبا ٹھلتے ہی گھل جائے گا موسم
جادو ہے تو پھر آب و ہوا پر گھنی چلے گا

اکبر مصوم
جب کہیں پھول میکتے دیکھے
پھر جرایدہ قبیار آیا

کرامت بخاری
کون سے ہونٹ ترے جنم کے خم چوئیں گے
کون خوش بخت تر ابیدر قبا کھولے گا

میشم علی آنا
ڈنیا پر کھل چکے ہیں سمجھی راز کن فکاں
ہم پر تو تیر بیدر قبا تک نہیں گھلا
میشم علی آنا

خوبیوں کے سب مکانے مل گئے ہیں آج تو
کتنے عقدے گھل گئے بیدر قبا کو موتے

میشم علی آنا
اک رات نہیں گھل گیا بیدر قبا کہیں
اُس رات ماہتاب سے لکھا گیا
میشم علی آنا

کیا محبت دماغ میں بعض کیمیکلز سے پیدا ہونے والی عارضی مستی ہے؟

پروفیسر پر اشکیف ناجوف

اگر دوسرے معاملات میں بھی وہ حصہ ویسا ہی ر عمل دکھائے۔ اور رومانوی محبت کا معاملہ ماں کی محبت یا اپنی پسندیدہ ٹیم کے لیے موجود چند بے سے مختلف نہیں تھا۔ لہذا نیروسانش، دول و جان سے فرنفہ ہونے کے جذبے کی وضاحت نہیں کر سکی ہے۔ کیا ہمیں مزید تجربات کرنے کی ضرورت ہے؟ سائنسدانوں کا جواب بالعموم اثبات میں ہوتا ہے۔ گراس کا مطلب یہ ہوگا کہ محبت کا جذبہ میکانیکی طور پر بینان کیا جاسکتا ہے۔ تو یہ کہا ہر فیملہ سادہ اور یکساں نہیں ہو سکتا کیونکہ انسان کے بس میں کہ وہ کسی ایک خاصیت کا اسیر ہو جائے۔ مثلاً دواز قائمی (لبے قد) کو ہر دور میں پرش شکھا جاتا ہے لیکن اگر انسان کا جسم اس کی خواہشات کا طالع ہوتا تو پرتوہر شخص دیوبیکل ہوتا۔

اس حقیقت سے تباہ چلتا ہے رومانوی دول کی وجہہ عمل ہے۔ یہ کیوں اتنا جعلی اور برجستہ اس کی وضاحت نہیں کی جاسکتی جیسا کہ دوسرے اہم فیلیے کرتے وقت ہم سوچ سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ کیا محبت کے معاملے میں بھی ہم معمولیت سے کام نہیں لے سکتے؟ عقل سے ہم ان معاملات میں کام لیتے ہیں جہاں ہم خود کو الگ رکھ کر ایسے فیصلہ کرنا ہوتے ہیں جنہیں دوسرے آزادانہ طور پر سمجھ کر ان پر عمل درآمد کر سکیں۔ محبت کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ یہ بس ہمارا فیصلہ صرف اپنے لیے ہوتا ہے۔ اور ویسے بھی محبوب کی خوبیاں بیان کر کے کون رقیب پیدا کرنا چاہے گا۔

انسانی جمالت کو عقل کے مقابلے میں کترکھنا غلطی ہو گی۔ یہ نہایت غیر معمولی انسانی جمالت کی ترقی ہے اور اتنے سارے عوام اس کے پیچھے کار فرما ہوتے ہیں کہ انھیں ایک ہی وقت میں بروے کار لانا ہماری عقل کے لیے شاید ممکن بھی نہ ہو۔ ٹھاٹ ایک جھرے کو پیچانا اسے بیان کرنے کے مقابلے میں لکھنا آسان ہے۔ پھر محبت کی پیچانا کرنا کیوں مختلف ہو سکتا ہے؟

اگر محبت کا اعصابی میکانیکی عمل بہت سادہ ہوتا تو ایک انجینئنر کسی کے لیے محبت پیدا کی جاسکتی اور اس طرح بغیر کسی دوسری چیز پر اثر انداز ہوئے اسے اپریشن کے ذریعہ سے کالا بھی ممکن ہوتا۔ لیکن اگر محبت کا معاملہ تنا پیچیدہ ہے، تو ہمارا الرقاء بھی نہ ہو پاتا۔ اس کے باوجود محبت کا انحصار، دوسرے خیالات، جذبات، عوامل پر۔ لیکن یہ کہا کہ محبت صرف دماغ میں کیا ہے تیر کا نام ہے بالکل ایسا ہے جیسے کہ جائے کے انگریزی ادب کے رومانوی کرداروں میں جو لیٹھ مخفی الفاظ ہیں۔ یہ تو نہ سمجھتے آئے والی بات ہو گی۔ آرٹ یا فون کی طرح محبت اس کے حصول کے مجموعے سے کہیں بڑی ہے۔

اس لیے ہم میں سے جو خوش نصیب محبت کی بے قراری کے تحریک سے گزر رہے ہیں

انھیں خود کو اس کی مندرجہ موجودوں کے پرداز دینا چاہے۔ اگر وہ ہمیں برداشت کے کسی

سکھانے ساصل پر اچھا دین تو ہم یہ سوچ کر خود کو لی دے لیں گے کہ عقل سے

کام لینے کا انجام بھی اس سے زیادہ مختلف نہ ہوتا۔

بھکریہ بی بی ای، لندن

کیا کوئی کسی کی محبت میں تمام عمر شارہ سکتا ہے؟ انسان کے اندر کیمیکل اور نفیلات کے پیچیدہ عمل سے پیدا ہونے والے رومانوی جذبات کیا وقت گزرنے کے ساتھ ماند پڑتے ہیں؟ محبت کا اسیر، محبت کا مارا، محبت میں انداخا، محبت میں پاگل، پہلی نظر میں ٹھاٹ، اور کسی کے لیے دول میں ترپتے پیار کے انہار کے لیے مختلف زبانوں میں راجح دوسری الگی ہی تراکب پر غور کر کر تو ان میں میانہ روی کے مجائے ہدت محسوس ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے۔ رومانوی محبت آگ کی طرح لیٹھ میں لینے والی، بانی کے ریلے کی طرح بھاٹے جانے والی اور بکلے کی طرح اڑاٹے جانے والی ہوتی ہے۔ ہم محبت کے بس میں زیادہ اور یہ ہمارے قابوں کی ہی آتی ہے۔ ایک طرف یہ ایک معنے کی طرح ہے تو دوسری طرف بہت سادہ ہی بات ہے۔ اس کا راستہ سیدھا سادہ اور انجام بسا اوقات، ممکنی ہو جانے پر، مختلف شاخوں میں بلا انتہا زمان و مکان طے شدہ ہوتا ہے۔

پھر بھی کسی کا پیار سانش سے نہیں بھیتا جاسکتا۔ ایسا کیوں ہے؟ جاندار جنسی خلاف کو عمل تو لید کے لیے اپنی آدمی کا پیغام فرمودنے کا ہلکا نہ والے کیمیائی مادے خارج کر کے دیتے ہیں۔ عام طور پر خالی کیا جاتا ہے کہ باہمی کاشش کا احصار ان ہی کیمیائی مادوں پر ہوتا ہے۔ بات دول کوئی ہے۔ اگرچہ حشرات الارض پاکیڑے کوڑوں میں جسی پیغام رسائی کے لیے فرمودنے ہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن انہیں میں اس کی موجودگی کے شاہد کم ہی ہیں۔ لیکن اگر کوئی کیمیکل جسم سے باہر کش کا اشارہ دیتا ہے تو جسم کے اندر کیوں نہیں؟ آسکی تو سین ہار مون کی مثال ہی لیجیے۔ اس کے بارے میں عام مغالطہ ہے کہ یہ "بندھن ہار مون" ہے اور یہ دو دوہ پیدا کرنے اور پچ دافنی کو سکنے میں مدد دیتا ہے۔ آسکی تو میں کی اس خاصیت کا مطالعہ پر پری نا ہی جنکی چھوپ ہوں میں کیا گیا۔ یہ چوہے اور ادھر منہ مارنے کے بجائے ایک ہی جیون ساختی ہناتے ہیں اور جسی محبت کا انہار سارہ عالم کرتے ہیں۔

جب ان چھوپوں میں آسکی تو سین کی پیداوار بند کر دی تو ان کے درمیان بندھن کمزور اور محبت کا انہار کم ہو گیا۔ اس کے برکھی ساختی اقسام کے اُن جنکی چھوپ ہوں میں جو ایک وقت میں کئی جسی ساختی رکھتے ہیں جب آسکی تو سین کی مقدار بڑھائی گئی تو ان کی شوت یا جسکی خواہش نہیں پڑ گئی۔ انہوں میں اس کے کاشرات زیادہ جی ان کن نہیں تھے۔ اس لیے پہ ہار مون محبت کے معاملے میں زیادہ کار آدمیں ہیں۔ اگر کوئی ایسا کیمیائی مادہ تیار بھی کر لیا گیا جو محبت کا پیغام محبوب کے دماغ تک لے جائے تو سوال یہ کہ وہ محبت نامے کہ کڈا لے گا کہاں پیدا کردہ دماغ کے اندر محبت کا کوئی لیٹھ پاکس تو ہے نہیں۔ اور پھر اس "اکھوں میں ایک" کی شاخت کیسے ممکن ہو گی کیونکہ ایسا کوئی سالہ یا ملکیوں سے ہی نہیں جس پر اس پیغام کو ختم نہیں کیا جاسکے۔ جب رومانوی محبت کو دماغ کی تصاویر کے ذریعے جا نجیحی کو شکنی گئی تو وہ حصے "روشن" نظر آئے جو کسی مقصود کے حصول کے بعد ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے دماغ کے کسی حصے کا کسی ایک معاملے میں چمک اٹھنے کا کوئی تمنی نہیں کیا جاسکتا

”پر تپال سنگھ بیتاب کی زیادہ تر غزلیں معروف اور رواں دوال
بھروسی میں ہیں، جنہیں وہ ہندی آہنگ کا ترکا سالگاتے رہتے ہیں
اور عام طور پر ان کا یہ امترانج ایک ایسے مخصوص انداز کی شکل میں
ڈھل جاتا ہے جو آنکھوں اور کانوں کو بھلا لاتا ہے۔“
(امجد اسلام امجد)

جدید شاعری کے معترض شاعر

پر تپال سنگھ بیتاب

کانیا شعری مجموعہ

سفر جاری ہے

کتابی سلسلہ

اردو جرنل

مدیر

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی
شعبۂ اردو، پٹنسہ یونیورسٹی، پٹنسہ (بہار)

سبق اردو

تفہیم

(مضامین)

ڈاکٹر صالح رشید

9935040160

: صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، یونی

۱۶۸

ڈیماں

عشرہ پہلی کیشنز، دہلی

”تفہیم“، ڈاکٹر صالح رشید کے مختلف موقع پر لکھے گئے
مضامین کا مجموعہ ہے، مغلستہ ہے۔ چودہ مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ
اپنے عنوانات ہی سے اپنی افادیت اور اہمیت کا پتہ دیتا
ہے۔ عنوانات ہیں:

1 ہندوستان میں پالی، عربی، فارسی، اردو۔ کل اور آج

2 فارسی صحافت کا ارتقاء اور ہندوستانی فارسی ادب میں اس کے نقش

3 امام محمد غزالی اور کہیاۓ سعادت

4 تاریخ اکبری۔ عہد اکبری کی ایک کم معروف تاریخ

5 سفیہ الاولیاء میں ذکر عارفات الصالحات اور ابیر بصری

6 ایرانی تصوف اور مولانا جلال الدین روی

7 تیرہویں صدی کی ایک خاتون حکمران۔ رضیہ سلطان

8 شاہنامہ فردوسی کے چند نسوانی کو در عالمہ جلی نعمانی کی قلم سے

9 نمایندۂ نسوان ایرانی۔ سیمین یہہنی

10 منتو کے معصر پندرہ فارسی افسانہ گار

11 اردو اصناف ادب پر فارسی کے اثرات

12 مولوی ذکاء اللہ۔ الہ آباد یونیورسٹی کے پہلے فارسی استاد

13 ڈاکٹر غلام سروہ۔ فارسی کی ایک کثیر التصانیف شخصیت

14 آشوب دہلی اور دہنبو

ہے خبرگرم...

Dated:27/01/2020

اردو نے جمہوری اقدار اور ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے:

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

قومی اردو کو نسل کے صدر دفتر میں یوم جمہوریہ کے موقع پر پرچم کشاںی کی تقریب

تھی دہلی۔ اردو نے جمہوری اقدار کی پاسداری اور تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے شعرا نے اپنی شاعری اور نثر نگاروں نے اپنی نثری لگارشات کے ذریعے ملک کی تعمیر و ترقی اور امن و پیغمبیری کو آگے بڑھایا۔ اردو گنگا جنی تہذیب کی نمائندہ اور بھائی چارے کی زبان ہے۔ اس نے ہمیشہ ملک میں محبت کو فروغ دیا۔ ان خیالات کا اظہار قومی کو نسل برائے فروغ اردو زبانی دہلی کے ڈاکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے یوم جمہوریہ کے موقع پر منعقدہ پرچم کشاںی کی تقریب میں کیا۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح ہمارے اسلاف نے ملک کی آزادی اور تعمیر و ترقی کے لیے جدوجہد کی اور نوع بہ نوع قربانیاں پیش کیں، اسی طرح ہمیں بھی اپنے ملک کے تینیں ہمیشہ قربانی کا جذبہ رکھنا چاہیے اور ملک کو آگے بڑھانے کے لیے ایمانداری اور دیانتداری سے کام لینا چاہیے۔ واضح رہے کہ یوم جمہوریہ کے موقع پر قومی اردو کو نسل جسولہ میں ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے پرچم کشاںی کی اور کو نسل کے عملہ کے ساتھ قومی ترانہ جن گن من بلند آواز سے پیش کیا۔

(رابطہ عامہ سیل)

گاندھی کے سپنوں کو آگے بڑھانے کی ضرورت: پروفیسر شاہد اختر داستان گوئی اردو ادب کا سرمایہ افتخار ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دہلی: موجودہ وقت میں گاندھی کے سپنوں کے بھارت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ گاندھی دراصل ایک نظریہ ہے۔ اس نظریے کے ذریعے ہم ملک میں امن و آشتوں کی فضا قائم کر سکتے ہیں۔ گاندھی جی محبت اور اہنسا کے متواale تھے اور اردو زبان انہی خیالات کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ یہ باتیں عالمی کتاب میلہ پر گتی میدان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام منعقدہ پروگرام داستان گوئی (داستان گاندھی) میں اردو کونسل کے وائس چیئر مین پروفیسر شاہد اختر نے کہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اردو داستان گوئی کی روایت بہت پرانی ہے لیکن بدلتے وقت میں یہ فن قصہ پارینہ بن گیا، البتہ حالیہ دنوں میں اس فن کو فروغ ملا ہے جو ایک خوش آئندہ بات ہے۔

قومی اردو کونسل کے ڈاکٹر کیٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی فن نیا اور پرانا نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار پیشکش پر ہوتا ہے۔ فوزیہ داستان گاہ اور فیروز خان نے جس لب ولجہ اور انداز میں داستان پیش کی، وہ قبل تعریف ہے۔ انہوں نے کہا کہ داستان گوئی اردو ادب کا سرمایہ افتخار ہے۔ ہمیں اس وراثت کو محفوظ رکھئے اور آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ داستان میں گنجائی تہذیب کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے ذریعہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

اس موقعے پر داستان گاندھی کے ہدایت کار پروفیسر دانش اقبال نے داستان گوئی کے حوالے سیر حاصل گنتگوئی۔ انہوں نے کہا کہ داستان گوئی ایک مشکل فن ہے، تاہم اس فن کے ذریعے سامعین تک اپنی بات پہنچانا ان کاروں کا فریضہ ہے۔ پروگرام کو فیروز خان اور فوزیہ داستان گوئے پیش کیا۔ فوزیہ ہندوستان کی پہلی خاتون داستان گوئیں۔ وہ اس سے قبل 'بھا بھارت'، 'راوھا کرشن' اور اپنے رام جی، جیسی داستانیں پیش کر کے شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ ان دونوں فرن کاروں نے 'داستان گاندھی' کے ذریعے گاندھی جی کی پوری زندگی کا خاکہ اپنائی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔ سامعین ان کی پیش کش اور اندازیاں سے لطف اندازو ہوتے رہے اور ساتھ ہی دادخیسیں سے بھی نوازتے رہے۔

پروگرام کی نظمت ڈاکٹر عبدالحی جبکہ اظہار تشكیل ڈاکٹر شیخ کوثریزادی نے پیش کیے۔ اس موقعے جو اہم شخصیات موجود ہیں، ان میں پروفیسر نصیر احمد خان، ایڈوکیٹ جناب اے حُسن اور این بیٹی کے ایڈیٹر ڈاکٹر شمس اقبال اور جناب کمل سنگھ کے نام خاص طور پر قبل ذکر ہیں۔

(رابطہ عامہ سیل)

ہندوستان کے عہد و سلطی کی تاریخ و تہذیب فارسی زبان و ادب میں محفوظ ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد قومی اردو کوئسل کے صدر دفتر میں فارسی زبان و ادب کی پینل میئنگ

نئی دہلی۔ ہندوستان کے عہد و سلطی کی تاریخ، تہذیب اور رثافت کا سارا سرایہ فارسی زبان و ادب میں محفوظ ہے۔ آٹھ سالہ تاریخ پر محیط عہد و سلطی میں فارسی زبان و ادب کے حوالے سے مختلف النوع کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں۔ اس کے باوجود فارسی زبان و ادب کی مربوط تاریخ کا فقدان ہے۔ اس کی کو دیکھتے ہوئے قومی اردو کوئسل نے ایک بہسٹ اور معتبر تاریخ کی ضرورت محسوس کی ہے تاکہ فارسی اور عہد و سلطی کے سرمائے کوئی نسل تک پہنچایا جاسکے۔ یہ باقی قومی اردو کوئسل کے ڈاکٹر یکشہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کوئسل کے صدر دفتر میں منعقدہ فارسی زبان و ادب کے پینل کی میئنگ میں کہیں۔ انہوں نے کہا کہ اردو میں صلاحیت پیدا کرنے کے لیے فارسی کا جاننا بہت ضروری ہے۔ بغیر فارسی کی افہام و تفہیم کے اردو زبان و ادب پر عور حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ یہ منصوبہ گزشتہ کی سالوں سے زیر غور رہا ہے، تاہم اب اسے حقی طور پر آئندہ چھ ماہ میں مکمل کر لیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ فارسی زبان و ادب کی تاریخ کو چار ابواب میں منقسم کیا گیا ہے اور ہر باب کے کئی ذیلی ابواب ہوں گے۔ اس کام کی تکمیل کے لیے ماہرین فارسی کی مددی باری ہے۔

اس موقع پر سید پروفیسر حسن عباس نے کہا کہ فارسی زبان و ادب کی تاریخ کے منظر عام پر آنے کے بعد واقعی قومی اردو کوئسل کی تاریخ میں ایک نئے روشن باب کا اضافہ ہو گا اور نئی نسل ملک کے مختلف حصوں میں بکھرے پڑے فارسی زبان و ادب سے متعلق علم و فنون سے آشنا ہو گی۔ پروفیسر ایج المیں قاسمی نے کہا کہ ہم قومی اردو کوئسل، بالخصوص جوان سال ڈاکٹر یکشہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے ممنون ہیں جو ہندوستان کی گزشتہ سات سو سالہ تاریخ کو قلم بند کرنے کے لیے کوشش ہیں جو یقیناً ایک غیر معمولی کام ہے۔ پینل کی صدارت پروفیسر آزری دخت صفوی نے کہا کہ یہ ایک انتہائی اہم موضوع ہے جس پر کوئسل نے کام کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ عہد و سلطی کے ہندوستان کے مختلف خطوں میں فارسی زبان و ادب کا غلبہ تھا اور شعر و ادب اپنی جو تخلیقات پیش کی ہیں، وہ اس عہد کی ترجیحی کرتی ہیں جسے ایک مربوط اور بہسٹ شکل میں لانے کی بات ہو رہی ہے۔ پینل میں پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر عبدالحیم کے علاوہ کوئسل کے اکیڈمک اسٹاف ڈاکٹر یکشہ ڈاکٹر شیخ کوثر یزدانی، ڈاکٹر فیروز عالم اسٹاف ایجوکیشن آفسر، جناب ساجد الحنف کے ساتھ ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

(رابطہ عامہ سیل)

سید محمد عقیل کا انتقال اردو ادب کا ناقابل تلاوی نقصان ہے: پروفیسر علی جاوید غالب اُشی ٹبوٹ میں انجمن ترقی اردو، ہند، قومی نسل برائے فروغ اردو بوزبان، غالباً اکادمی، دلی اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دلی پیغمبری، جواہر لال نہرو پیغمبری کے شعبہ جات اور انجمن ترقی پسند مصطفیٰ کی مشاہرا کت سے معروف ترقی پسند نقاد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کے سانحہ ارتحال پر تعریتی جلسے کا نقصاد ہوا۔ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے پروفیسر علی جاوید نے کہا مجھے عقیل رضوی صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ وہی مجھے اللہ آباد لے کر آئے اور میری تربیت کی۔ وہ ادب ہی نہیں ہرچیز کو خلقی انداز میں دیکھنے کے عادی تھے۔ انہوں نے مرہیے کہ جامی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جوانی کی اولیات میں ہے۔ ان کی کتاب نبی علامت نگاری ہر طالب علم کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ یہ کتاب ترقی پسندی اور جدید بہت کے بنیادی مسائل کو مجھے میں بہت معادن ہے۔ غالب اُشی ٹبوٹ کے ڈاکٹر سید رضا حیدر نے کہا کہ سید محمد عقیل رضوی نے ایک طویل علاالت کے بعد انتقال کیا لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی موت ایسا خلایپیدا کر دیتی جس کا پروناہ ممکن نہیں۔ سید محمد عقیل رضوی کا تعلق اردو کے مقام اداروں سے رہا لیکن پچھلے چالیس برسوں سے وہ کسی نہ کسی طور پر غالب اُشی ٹبوٹ سے باہست رہے ان کی تحریریں غالباً نامہ میں شائع ہوتی رہیں اور مختلف انداز سے وہ ہماری علمی رہنمائی کرتے رہے۔ خدا ان کے درجات پاندرہ ماہی اور اس خلا جلد پر کرے جوان کے جانے سے پیدا ہوا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے ہنزہ سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ میں ان کا باضابطہ شاگرد تو نہیں رہا لیکن ان کی شخصی اور تحریریوں سے میں نے رہنمائی ضرور حاصل کی ہے۔ میں نے پہلی بار انجمن ترقی پسند مصطفیٰ کے اجلس میں ان کو دیکھا تھا اور مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی آئینی کا شروع صرف اردو تک محدود نہیں ہے وہ مختلف علوم سے خاصی واقفیت رکھتے تھے اسی لیے مسائل کو دیکھنے کا نظریہ سب سے الگ تھا۔ دلی اردو اکادمی کے واکس چیزیں اور شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ میں نے بزرگوں سے سنا ہے اور خود ہمیں اس بات کو دیکھنا اصل میں خود کے زندہ ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ میری عقیل صاحب سے چند ملاقات میں رہیں وہ نہایت مشق اور مہریان بزرگ واستاد کی طرح اپنے ملنے والوں اور شاگردوں سے پیش آتے تھے۔ علی گڑھ میں ایک مرتبہ سیناری میں ایک عروضی بجٹ چھٹری اور عقیل صاحب کی بات قول نیعل ہابت ہوئی اس دن ان کی شخصیت کا یہ پہلو میرے سامنے آیا کہ وہ عروض سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ غالباً اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا سید محمد عقیل رضوی اور پروفیسر محمد حسن میں گھرے مرام تھے لہذا وہ جے۔ این۔ پورا بآتے تھے وہیں ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی تصنیف میں ایک داعی ربط ہے اور اسی کے ذریعے ادب کی تاریخ بھی بنتی ہے۔ ان کی تصنیف ادبی مسائل کو مجھے میں میری رہبری کی ہے۔ اگرچہ ہمارے نقش میں نہیں ہیں لیکن ان کی کتابیں ہیش روٹی دیتی رہیں گی۔ پروفیسر اختر مہدی نے کہا کہ ان کی جس بات نے مجھے سب سے زیادہ تاثر کیا ہے کہ ابھی ہیش اپنی معلومات میں اضافے کی فکر رکھتی تھی۔ ان کے ذہن میں اسی سلسلے کوئے کراگر کرنی تھک ہوتا تھا تو وہ جب تک اس کو دور نہ کر لیتے بے جھنیں رکھتے تھے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ عالم کی موت ایک عام کی موت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نگاہیم نے کہا کہ میں ان کی شاگردہ تو نہیں رہی لیکن ان کے ساتھ چند یادگار ملاقات میں ضرور ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے میرے گھر پر قیام بھی کیا اور مجھ سے کہا کہم نے منتو پر کام کیا ہے میں محاری تھیں دیکھنا چاہتا ہوں ہوں مجھے کچھ غوف بھی ہوا لیکن میں نے تھیں دے دیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے چند گھنٹوں میں پوری تھیں پڑھ دیں اور مجھ سے کہا کہ کام تو اچھا کیا ہے لیکن اس میں جھنڈ میں کا برش، کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ تجزیے والے باب میں تو نہیں ہے لیکن جہاں ان کی افسانہ نگاری سے متعلق گفتگو ہے وہاں میں نے ذکر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور بولے کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تھیں اس کا علم ہے یا نہیں۔ وہ شفیق بھی تھے لیکن علمی معاشرات میں مروٹ کم کرتے تھے اور یہ ان کی تربیت کا طریقہ تھا۔ اس موقع ادبی شخصیات، رفتار اور طبلاء دو منٹ خاموش رہ کر مرحوم کی تکمیل روح کے لیے دعا کی۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

ان طویل زمانی ہواں میں سبق اردو 48 خلائق جھوکے کی طرح ملا جس میں پالیسی کی بڑی واضح تبدیلیاں نظر آئیں۔ عصر حاضر میں پوری دنیا میں شش الہانی فاروقی اور گونی چند نارنگ اردو زبان و ادب کی دوسرا سے بڑی شخصیات ہیں۔ ان سے متاثر ہوئے بن نیشن رہا جاسکتا اور یہ کوئی بڑی بات بھی نہیں۔ لیکن اس سمجھیدہ ادبی رسالے کو غیر جانب دار ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ کے اداریوں کا الجھہ بھیشہ سمجھیدہ ہوتا ہے جن میں عصری نہرو بازیاں نہیں رہتیں۔

بلرانج بخشی

اوڈم پور، جمو، کشمیر۔ (بی۔ٹی)



ویب سائٹ (www.sabaqeurd.com) بھی زبردست ہے۔

ابرار مجیب

نمی دہلی



گاہے گاہے کوئی شمارہ ”سبق اردو“ کا عنایت ہوتا رہتا ہے۔ حال ہی میں شمارہ نمبر ۲۸ موصول ہوا ہے۔ قیمت مضامین ہیں۔ کوراچندر سنگھ بیدی پر وافر معلومات ہیں۔ گوپی چند نارنگ صاحب پر کچھ لکھنا سورج کو چاغ دھانے کے متادارف ہے۔ ڈاکٹر زیب احمد کا جمل سلطانپوری پر اچھا مضمون ہے۔ البتہ شام تہائی کی ادائی بے وجہ ہے.....

ہم کو ان سے وفا کی کیوں امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے (تھیں)

رفیق رازی کی غزلیات نے متوجہ اور متاثر کیا۔ اب ضرورت ہے کہ نصاب میں ہم عصر شعر کو شامل کیا جائے۔ (اختیاری پر چکے طور پر)
شعبہ اردو کے طلباء کو معیاری ادبی رسالے خریدنا ضروری قرار دیا جائے۔ اس وقت استاد مختار مسید عظیل رضوی صاحب کے جانے کے صدمے سے دوچار ہوں۔

شہزاد صحیح

اے ذی ہی (کانج) الہ آباد



میں اس رسالے کی قدر کرتی ہوں۔
ایسے ادبی رسائل اردو میں شازد نادری رہ گئے ہیں۔

اسنی بدر

سعودیہ عربیہ



INTERNATIONAL REFEREED JOURNAL

ISSN 2321-1601

SABAQ E URDU (Monthly)

Infront of Police Chowki,G.T.Road,Gopiganj-221303,Dist.Bhadoli, UP,INDIA

EDITORIAL BOARD

INDIA

FOREIGN

1.PROFESSOR KHALWA MD. EKRAMUDDIN Centre of Indian Languages School of Language, Literature and Culture Studies,JNU,DELHI	1.DR.TAQI ABIDI,CANADA URDU CRITIC
2.PROFESSOR IBNE KANWAL DEPT.OF URDU,DELHI UNIVERSITY,DELHI	2.PROFESSOR NASIR ABBAS NAYYAR FICTON WRITER &CRITIC
3.PROFESSOR SHAHZAD ANJUM HOD ,JAMIA MILLIA ISLAMIA	3.PROFESSOR SOYA MA NE,WRITER JAPAN
4.PROFESSOR SHAIKH AQUIL AHMAD DIRECTOR,NATIONAL COUNCIL FOR PROMOTION OF URDU LANGUAGE	4.DR. IBRAHIM MOHD IBRAHIM DEPT. OF URDU,AL-ALAZHAR
5.DR.ZEBA MAHMOOD HOD,DEPT.OF URDU G.S.P.G.COLLEGE,SULTANPUR(UP)	5.PROFESSOR SOHAIL ABBAS DEPT. OF URDU,UNIVERSITY OF TOKYO abbaskhansuhail@gmail.com
6.DR.AJAY MALVIYA G.C.MEMBER OF SAHITYA AKADEMI,NEW DELHI	6.DR.ALI BYAT DEPT.OF URDU UNIVERSITY OF TEHRAN bayatali@ut.ac.ir

CHIEF EDITOR:DR.DANISH ALLAHABADI,EDITOR:DR.MOHD.SALEEM